جلد ۱۳ - شمارہ ۳
رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۱۰۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

پریس کی مصروفیت سے اس ماہ کا رسالہ دو چار دن کی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ منیجر

فہرست مضامین مارچ سنہ ۱۹۲۸ء

ملاحظات	نیاز	۲
خلیل علی خاں اشک	سید محمد قادری بی اے	۵
تیرِ عشق (افسانہ)	سید علی عباس حسینی ام اے	۱۲
نقد الشعر	کیفی چریا کوٹی	۳۱
عجیب و غریب خواب	سید فیاض علی بی اے ال ال بی	۳۶
فلسفۂ مذہب	سید مقبول احمد بی اے	۵۳
زلزلہ (افسانہ)	حامد اللہ افسر بی اے	۶۱
ڈائری کا ایک ورق	نیاز	۶۸
چنگاری (افسانہ)	نیاز	۷۳
باب الاستفسار	نیاز	۷۷

منظومات :-

ہمالیہ سے دو دو باتیں	شیام لال جگمی بی اے بریلوی	۸۸
ترانہ	اختر شیرانی	۹۰
مصطلحات امیں	امین حزیں	۹۲
دورِ جدید کا آغاز	محمود اسرائیلی	۹۲
چاند اور ہم	افسر میرٹھی	۹۳
لحد کی پہلی شب	کیفی چریا کوٹی	۹۳
حسیات	نظیر لودھیانوی	۹۵
غزل	تبسم صہبائی	۹۶

تیار ہے - لغت اسلامی جلد اول - قیمت ...... ہے علاوہ محصول ...... منیجر نگار لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد (۱۳) | مارچ سنہ ۱۹۲۸ | شمار (۳)

ملاحظات

ایک ترکی شاعر اپنی محبوبہ کے پاس اپنی تصویر بھیجتا ہے اور اس پر ایک شعر لکھتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ "اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ تو مجھے دیکھے بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ میری چشم حیراں تجھے دیکھا کرے"۔ غالب کہتا ہے :-

تا چہ آئینۂ حسرت دیدار توام
جلوہ بر خود کن و ما را بہ نگاہے دریاب

بہرحال میں اپنی تصویر پیش کرتے وقت نہ یہ کہہ سکتا ہوں نہ وہ، بلکہ دنیائے شاعری سے بالکل علیحدہ ہو کر مجھے نہایت سادگی کیساتھ صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس تصویر کی اشاعت سے اگر ایک طرف بعض احباب کے حکم کی تعمیل مقصود ہے تو دوسری طرف یہ خیال بھی ہے کہ آپ جس شخص کی سیرت کا مطالعہ بہ وساطت اس کے آدا و افکار کے سات سال سے کرتے چلے آرہے ہیں اگر آپ اسکی صورت کو بھی ایک مرتبہ دیکھ لیں تو کیا حرج ہے۔

ممکن ہے بعض حضرات اُس ذہنی تصویر کے لحاظ سے جو انھوں نے قایم کی ہو گی مجھے بہت مختلف پائیں، لیکن اب کہ میں خود آپ کے مواجہہ میں حاضر ہوں، سابق تصور و قیاس کے نتایج کو محو کر ڈالئے اور اب پھر غور کر کے فیصلہ کیجئے کہ آپ کسی ایسے شخص سے تو معاملہ

نہیں کرتے، جس کے ظاہر و باطن دونوں بالکل یکساں ہیں ——— آپ اپنی جگہ جو جی چاہے فیصلہ کریں، لیکن اگر میرے سامنے یہ تصویر پیش کی جاتی تو میں صاحب تصویر کی سیرت کے متعلق اول نگاہ میں فیصلہ کر دیتا کہ

"گو زشت روست امّا طبع جمیل دارد"

اس سے قبل متعدد رسایل میں میری تصویریں شائع ہو چکی ہیں، لیکن وہ سب فن کے لحاظ سے اس قدر ناقص ہیں کہ اُن کے دیکھنے کے بعد میرے متعلق کوئی صحیح حکم نہیں لگایا جا سکتا، کہیں موقف و محل نے میری صحیح نظرت پر پردہ ڈال دیا ہے، اور کسی میں نور و ظل کی عدم مناسبت نے وہ بات پیدا کر دی ہے جو حقیقتاً مجھ میں نہیں ہے۔ بہر حال اس وقت جو تصویر پیش کی جا رہی ہے وہ میری تازہ ترین شبیہ ہے جس میں بطون کے چھپانے کے متعلق کوشش نہیں کی گئی۔ اس لئے میں ذمہ دار نہ ہونگا اگر آپ میرے متعلق یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گئے کہ

"ہے وہی پوشیدہ اور کافر کھلا"

اس ماہ کے مضامین میں پہلا مقالہ جناب سید محمد قادری بی اے کا ہے جو تاریخ ادب کی حیثیت سے قابل مطالعہ ہے۔ فسانہ بزم عشق کے متعلق میں نے اپنی مفصل رائے اختتام فسانہ پر درج کر دی ہے اسے ملاحظہ کیجئے۔ نقد الشعر بہت مفید و کارآمد مضمون ہے اگر انجام تک پہونچ جائے۔ سید فیاض علی صاحب بی اے نے اپنے خواب میں جس لطف و کیفیت کے ساتھ پردۂ نسواں کے مسئلہ پر بحث کی ہے اس کی داد نہ دینا ظلم ہے گو میں اصل مسئلہ میں فاضل مقالہ نگار کی رائے سے اختلاف رکھتا ہوں۔ "فلسفۂ مذہب" کے عنوان سے جو مضمون شروع کیا گیا ہے وہ ایسے روشن دماغ کا نتیجہ ہے جس نے تمام اسلامی ممالک کی ناقدانہ سیاحت اور عالمانہ مطالعہ کے بعد، مذہب کو موجودہ نظام تمدن کے لحاظ سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور جو مذہب کا حقیقی فلسفہ وہ پیش کرنا چاہتے ہیں اسے "دیوبند اور فرنگی محل" سے اتنا ہی بُعد حاصل ہے جتنا وہ حقیقت سے قریب ہے۔ یہ مضمون فی الحال مسلسل درج ہوتا رہیگا اور بعد کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے گا۔

"فسانہ زلزلہ" جناب افسر میرٹھی کے فشارِ دماغ کا نتیجہ ہے۔ "فشار دماغ" اس لئے کہ انھوں نے واقعتاً خراب ہیکر اس کی کیفیات کو اس میں قلمبند کیا ہے۔ یہ میرا خیال ہے ممکن ہے کہ غلط ہو۔ پلاٹ مختصر ہے مگر دلچسپ۔ اخیر کی دو سطریں اگر حذف کر دی جاتیں، تو ایک پر لطف خلا ذہن سامع کے پُر کرنے کے لئے پیدا ہو جاتا۔ مضامین چنگاری اور ڈائری کے متعلق صرف یہ کہنا ہے کہ گو معمولی ہیں لیکن ہیں میرے اپنے ہی (A poor thing but mine own)

باب استفسار میں حسنِ یوسف کے متعلق جو مضامین میرے مضمون کی تردید میں آئے تھے ان کا جواب دیا گیا ہے۔

حصۂ نظم میں جناب اختر شیرانی کا ترانہ زیادہ لطف کے ساتھ پڑھا جاتا اگر وہ ڈراما بھی سامنے ہوتا جس کا یہ آخری ورق ہے جناب جگر بریلوی نے "ہمالیہ سے دو دو باتیں" کرتے ہوئے جذبات وطن پرستی کا اظہار نہایت کامیاب طور پر کیا ہے۔ لحد کی پہلی شب بہ لحاظ بصیرت و اعتبار خاص پایہ کی نظم ہے۔ چاند کی نظم میں جناب افسر نے جس پاکیزہ و لطیف تخئیل سے کام لیا ہے وہ اس قدر

اخیری (Ethereal) کیفیت رکھتی ہے کہ اس سے لطف اُٹھانے کے لئے ہر دماغ مستعد نہیں ہو سکتا۔

"دورِ جدید کا آغاز" ملی نظم ہے اور اس قسم کی نظمیں لکھنے میں جناب محمود اسرائیلی کو خاص سلیقہ حاصل ہے۔ مصطلحات امین نہایت ہی دلچسپ لیکن قریبِ حقیقت تادلیں ہیں۔ جناب امین حزیں کی شاعری کی یہ خصوصیت کہ وہ اپنے "پیام" خصوصی سے کبھی انحراف نہیں کرتے۔ میرے نزدیک بہت زیادہ قابلِ قدر ہے۔

مجھے حد درجہ افسوس ہے کہ جناب اقدس حیدرآبادی جن کا مضمون فسانۂ اردو کے عنوان سے گزشتہ ماہ کے نگار میں شائع ہوا تھا، پلیگ میں مبتلا ہو کر انتقال کر گئے۔ جناب اقدس بہت ہونہار نوجوان تھے، لیکن فطرت جس کے لب و دندان، دست و ناخن بقول ٹینی سن ہمیشہ خوں آلود رہتے ہیں اس کا بہترین مشغلہ یہی ہے کہ پھولوں کو مرجھانے کے لئے مہلت دے اور کلیوں کو پھول ہونے سے قبل توڑ کر برباد کر دے۔ میں ان کے اعزہ و احباب کے ساتھ اس ماتم میں شریک ہوں اور حد درجہ تاثر کے ساتھ۔

جناب اعظم کریوی کی تحریر سے معلوم ہوا کہ لاہور کے اخبار بھیشم نے ان کے فسانہ کو جو پریم کی چوڑیاں کے عنوان سے فروری ۱۹۳۸ء کے نگار میں شائع ہو چکا ہے، مسخ کر کے ۲۶ فروری کے مسرتِ شدہ اڈیشن میں شائع کیا ہے، لیکن نہ اس نے نگار کا حوالہ دیا نہ جناب اعظم کا نام درج کیا۔

نیاز

اسے ضرور پڑھیے

گزشتہ اشاعت میں اعلان کیا گیا تھا کہ اس ماہ سے تذکرۂ شعرا شروع کیا جائے گا، لیکن چونکہ اس کو کتابی صورت میں شائع کرنا تجویز کیا گیا ہے اس لئے رسالہ میں اس کی اشاعت روک دی گئی۔ اس تذکرہ میں تقریباً ۳۰۰ قدیم و جدید طریقہ شاعروں کے حالات معہ ان کے منتخب کلام کے درج ہوں گے اور ضخامت کے لحاظ سے اس کی قیمت تین روپیہ سے کم نہ ہوگی۔ اس تذکرہ کی کتابت شروع ہو گئی ہے اور جلد سے جلد پبلک کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ جو حضرات ابھی سے اس کے خریدار ہو جائیں گے ان سے بجائے تین روپیہ کے صرف دو روپیہ لئے جائیں گے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اخیر مارچ تک ان کی رقم وصول ہو جائے۔

منیجر "نگار" لکھنؤ

خلیل علی خان اشک اور انکی تالیف کا تنقیدی مطالعہ

فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے ارباب قلم میں خلیل علی خاں ہی، ایک ایسے مولف ہیں جن کی کتاب تو بے حد مقبول اور رائج ہوئی مگر وہ اسکی بدولت مشہور ہونے کے بجائے بالکل پردہ گمنامی میں رہے۔ قصۂ امیر حمزہ سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے۔ اس زمانہ میں بھی جبکہ اردو زبان نے ترقی کے کئی مدارج طے کر لئے ہیں اور اس میں ناولوں قصوں اور مختصر افسانوں کا کافی ذخیرہ موجود ہے اور روز بروز بڑھتا جا رہا ہے، قصہ امیر حمزہ کے شائق اکثر جگہ نظر آتے ہیں اور اب بھی اس کتاب کی تھوڑی بہت قدر قصہ پسند پبلک کو ہے۔ مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ خلیل علیخاں کی محنت شاقہ نے اُن کو نام و نمود سے اب تک بالکل محروم رکھا اور شاید یہ پہلی مرتبہ ہے کہ انکا نام اُن کے اپنے کارناموں کے ساتھ اردو داں پبلک سے متعارف کرایا جا رہا ہے۔ اُنھوں نے جس کاوش اور محنت سے داستان امیر حمزہ سی ضخیم کتاب جو کئی سو صفحات پر مشتمل ہے لکھی ہے، اس کی داد دینا تو کجا آج تک کسی نے اس خصوص میں انکا ذکر بھی نہیں کیا۔

ہم نے اردو شاعروں کے تقریباً تمام تذکروں کی ورق گردانی کر ڈالی مگر ان کا حال کسی میں بھی نہیں ملا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اُن کے حالات وغیرہ کے متعلق بہت ہی کم معلومات رکھتے ہیں۔ ان کی مولفہ کتابیں بھی ان کے حالات پر کچھ روشنی نہیں ڈال سکتیں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے مولوی عبدالحق صاحب مدیر رسالہ اردو نے "اہل یورپ نے اردو زبان کی کیا خدمت کی" کے عنوان سے جو مضمون فورٹ ولیم کالج کے ادبی کارناموں پر لکھا ہے اس میں خلیل علی خاں کا ذکر کیا ہے۔ مگر صرف اتنا ہی کہ انھوں نے سنہ ۱۸۰۳ء میں کپتان ٹیلر کے حکم سے اکبر نامہ علامہ ابو الفضل کو "واقعات اکبر" کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا جو شائع نہیں ہوا[1]۔ پھر مولوی محمد یحییٰ تنہا نے اپنی کتاب میں جو ذکر کیا ہے وہ سر بسر مولوی عبدالحق صاحب کے بیان کی نقل ہے اور اس میں ایک لفظ کا بھی اضافہ نہیں ہوا[2]۔ ان دونوں نے خلیل علیخاں کو خلیل اللہ خاں لکھا ہے مگر اُن کی جو کتاب ہمارے پیش نظر ہے اس میں صاف طور پر خلیل ہی خاں مندرج ہے۔ اور اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہم آگے کسی موقع پر اشک کا وہ بیان نقل کر دیں گے جس سے انکا اصلی نام معلوم ہو سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ اشک نے اپنے آبا و اجداد اور مولد و وطن کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ ان کی تاریخ ولادت و وفات تو کجا، مقام پیدائش و تعلیم و تربیت تک کا حال معلوم نہیں۔ بہر حال صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ فورٹ ولیم کالج کے ابتدائی اہل قلم میں سے ہیں۔ ان کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابتداً کالج کے تنخواہ دار منشی نہیں تھے غالباً ڈاکٹر گلکرسٹ کی ایما سے اپنے طور پر یہ کتاب مرتب کی ہوگی اور پھر کالج کے متوسل ہو گئے۔

اب تک انکی تالیفات میں صرف دو کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہی دو کتابیں اُن کی یادگار ہوں اور ان کے علاوہ

---

[1] رسالہ اردو ۱۵ صفحہ ۵۰۵ [2] سیر المصنفین صفحہ ۱۳۶

کسی دوسری تالیف مرتب کرنے کا موقع نہ ملا ہو۔ ان میں سے پہلے قصۂ امیر حمزہ ہے۔ یہ طولانی اور ضخیم قصہ ڈاکٹر گلکرسٹ کے ایما سے ۱۲۱۵ھ میں لکھا گیا ہے۔ اس قصہ کے اصل مصنف کے متعلق مختلف خیالات ہیں۔ اور کوئی قطعی و یقینی رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ ہمارے سامنے جو نسخہ ہے اس میں اشک نے لکھا ہے کہ ابتداً یہ قصہ سلطان محمود غزنوی (۳۸۸ھ تا ۴۲۱ھ) کے خوش کرنے اور اس فاتح اعظم کو ملک گیری و کشور کشائی کے لئے آمادہ و تیار رکھنے کے لئے کئی ایک راویوں اور داستان گویوں نے چودہ جلدوں میں تصنیف کیا۔ ایک اور موقع پر میں نے ہی اُس کو ملّا جلال بلخی سے منسوب کیا ہے۔ برٹش میوزیم میں ایک فارسی نسخہ محفوظ ہے اس میں اس کا مصنف شاہ ناصر الدین محمد کو بتایا گیا ہے۔ اس میوزیم میں دوسرا نسخہ ابو المعالی کے نام سے منسوب ہے۔ بعض لوگوں نے اُس کو فیضی کے تخلیقی دماغ کی پیداوار بتایا ہے۔ غرض وہ مثل ہے جتنے منہ اتنی باتیں۔ ہماری دسترس میں اصل فارسی نسخے نہیں ہیں اور شاید ہندوستان میں بہت کم جگہ فارسی نسخے ہونگے۔ پھر یہ بھی شبہ ہے کہ یہ قصہ ابتداً عربی میں لکھا گیا یا فارسی میں تصنیف ہوا۔

خلیل علی خان اشک اور دیگر ہندستانی مولفین کے جو نسخے دستیاب ہوئے ہیں ان سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہو کہ اصل قصہ فارسی پر اتنا طویل نہیں تھا۔ ان لوگوں نے اس میں ہندوستانی عنصر کو داخل کرکے اپنا لیا ہے۔ آگے اس پر ہم ذرا تفصیل سے بحث کریں گے۔ جیسا کہ ابھی ہم نے اوپر لکھا ہے۔ اشک نے اُس کو ۱۲۱۵ھ میں مرتب کیا اور معلوم ہوتا ہے کہ ان سے پہلے اردو میں کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ اور سب سے پہلے اشک نے ہی اُس صاف زبان میں نو آموزانِ اردو کے لئے تالیف کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

مخفی نہ رہے کہ بنیاد اس قصہ دلچسپ کی سلطان محمود بادشاہ کے وقت سے ہے اور اس زمانہ میں جہاں تک راویانِ شیریں کلام تھے انھوں نے آپس میں مل کر واسطے سنانے اور دلانے منصوبے لڑائیوں اور قلعہ گیری اور ملک گیری کے خاص بادشاہ کے واسطے امیر حمزہ صاحب کے قصہ کی چودہ جلدیں تصنیف کی تھیں۔ ہر رات کو ایک ایک داستان حضور میں سناتے تھے۔ انعام و اکرام پاتے تھے۔ اب شاہ عالی جاہ عالم بادشاہ کے عہد میں مطابق ۱۲۱۵ھ اور ۱۸۰۱ء کے خلیل علی خاں نے جو متخلص بہ اشک ہیں، حسب فرمائش مسٹر گل کرسٹ صاحب عالیشان والا مناقب بنابر نو آموزان زبان ہندی اس قصہ کو اردوئے معلّیٰ میں لکھا تھا کہ صاحبانِ مبتدیان کے پڑھنے کو آسان ہووے۔"

اشک کے نسخہ پر بحث کرنے سے قبل ایک نظر مروجہ اور جدید نسخوں پر بھی ڈال لینی ضروری ہے۔ مروجہ نسخوں میں سب سے پہلے منشی نولکشور کا طبع کرایا ہوا نسخہ ہے۔ اُس کو حافظ سید عبد اللہ بلگرامی نے ترتیب دیا تھا اور بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے بڑی محنت سے تعقید عبارت دور کرکے اردوئے معلّیٰ کا جامہ پہنایا۔ یہ نسخہ بہت مقبول ہوا۔ چنانچہ چند ہی مہینے میں پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا پھر دوسرا ایڈیشن اور شائع ہوا۔ چوتھی مرتبہ نولکشور پریس کے مشہور مصحح سید تصدق حسین مرحوم نے جو عربی فارسی کے بڑے ماہر تھے اور جن کی یادگار فارسی کی متداولہ و مشہور لغت "لغات کشوری" اب تک مقبول خاص و عام ہے، اس کی نظر ثانی کی۔ تصدق حسین لکھنؤ کے باشندے تھے اور انکی زبان عربی، فارسی سے اس قدر متاثر تھی کہ ہر عبارت میں عربیت اور رنگینی ٹپکتی ہے۔ انھوں نے نظر ثانی میں اُس کو تکلفات و تصنعات

لہ قصہ امیر حمزہ مطبوعہ مطبع پرکاش دہلی ص۲

لفظی سے فسانۂ عجائب کا جواب بنا دیا اور جا بجا اپنی طرف سے بے حد اضافہ کیا۔ اور خود بھی بڑے افتخار کے ساتھ دعویٰ کیا ہے کہ "بطور نثر فسانۂ عجائب ترتیب دیا"۔ اس سلسلہ میں اُنھوں نے در پردہ خلیل علی خاں کی عبارت کو تعقید سے معمور بتایا ہے اور اس کو صاف زبان میں لکھنے کا سہرا حافظ سید عبد اللہ بلگرامی کے سر باندھا ہے۔ مگر یہ سراسر غلط ہے اشک کی عبارت بے حد صاف اور سیدھی ہے۔ آگے ہم دونوں کی تھوڑی تھوڑی عبارت جو ایک ہی مضمون کے متعلق ہے نقل کر کے اس غلط بیانی کا پردہ فاش کر دیں گے۔

تصدق حسین کا مصحح نسخہ بھی بہت مقبول ہوا۔ اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا طرز بیان جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے بالکل فسانۂ عجائب کی تقلید ہے اور ان کو خود بھی نہ صرف اس کا اعتراف بلکہ اس پر افتخار ہے۔ اس میں سادگی و صفائی نام کو نہیں اس نقص کے بعد بھی اس کا مقبول ہونا قوم کی تکلف پسندی اور بگڑے ہوئے مذاق کی دلیل ہے۔ ہر ملک و قوم کی تاریخ ادبیات میں ایک دور ایسا ضرور ملتا ہے جبکہ ادب سے اصلیت دور ہو جاتی ہے اور بجائے معنوی خوبیوں کے لوگ ظاہری محاسن اور لفظی آرائش کو پسند کرنے لگتے ہیں۔ صفائی اور سادگی پر تکلفات اور صنائع بدائع کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ایسا زمانہ حقیقی ادب کی پیداوار سے محروم رہتا ہے اور اس کا لٹریچر "ادب عالیہ" نہیں بن سکتا ہے۔ اس کی بہار صرف چند روزہ ہوتی ہے اور کاغذی پھولوں کی طرح وہ بھی ایک محدود عرصہ تک پبلک کے مرغوب طبع رہ کر فنا ہو جاتا ہے۔ انگریزی ادبیات میں پوپ (Pope) اور اس کے مقلدین کی شاعری کا بھی یہی حال ہے۔ فارسی کے متاخر غزل گویوں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ خیالات میں اصلیت، سادگی اور جوش مفقود ہے۔ صرف الفاظ ہی الفاظ ہیں جن میں تاثیر نہیں۔ اسی طرح فارسی کے متاخر نثر نویسوں کے کارنامے بھی اصلیت سے دور ہیں۔ چہار مقالہ نظامی عروضی سفر نامہ حکیم ناصر خسرو کے مقابلہ میں سہ نثر ظہوری اور رسائل طغرائے مشہدی کو ہمیشہ ہرگز فروغ حاصل نہیں ہو سکتا ایک میں بقائے دوام کے آثار ہیں اور دوسرے میں چند روزہ لطف اور موقتی پسندیدگی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اردو میں فسانۂ عجائب اور تصدق حسین کی مصحح داستان امیر حمزہ اور اسی قسم کی دوسری کتابوں کا بھی یہی حال ہے۔ جس طرح اردو شاعر کا مذاق بگڑتے بگڑتے صرف لفاظی اور نقالی رہ گئی نثر نویس بھی اس قعر میں گر پڑے اور چونکہ ایک زمانہ میں رنگینی طبع اور غفلت سے یہی طرز بیان مقبول تھا۔ ان کتابوں کو بھی قبولیت مل گئی مگر اب علوم جدید کی ترقی کے ساتھ قوم کے مذاق میں بھی تبدیلی پیدا ہو چلی ہے اور اس قسم کی کتابوں سے عوام کو وہ دلچسپی باقی نہیں رہی جو پہلے تھی، اسی داستان امیر حمزہ کو لیجئے۔ اب سے گیارہ سال پیشتر اس کا بارھواں ایڈیشن شائع ہوا تھا۔ اب تک دوبارہ چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس ایڈیشن کے بیسیوں نسخے قصہ فروشوں کے ہاں پڑے ہوئے ہیں اور کوئی پوچھتا نہیں۔ حالانکہ اس سے پیشتر اس کتاب کی اس قدر مانگ تھی کہ چند ہی سال میں گیارہ ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔

اُس کے برخلاف خلیل علی کا ترجمہ سیدھی سادی زبان، سلاست اور صفائی کا اچھا نمونہ ہے اس کی عبارتیں گنجلک اور تعقید سے پاک ہیں اور اس کی سادگی و صفائی میں اس کی دلکشی کا راز پنہاں ہے۔ مگر قوم کا مذاق بگڑ جانے سے اس کی مقبولیت زیادہ نہ ہوئی

اور اب تک تصدق حسین والا ترجمہ لوگوں کو اپنا گرویدہ بنائے رہا۔ اگرچہ اب قدیم قصوں کی طرف سے انکی فوق العادت اور خلاف فطرت باتوں کی وجہ سے لوگوں کی دلچسپی کم ہوتی جارہی ہے مگر اشک کا "قصہ امیر حمزہ" اور اس کے ساتھ بعض دیگر کتابوں میں ایسے جوہر ضرور موجود ہیں جو پھر ایک بار اُن کو مقبولیت دلا سکتے ہیں۔ جب افسانہ کا احیا ہوگا تو بلحاظ اصلیت و سادگی ان قصوں کو بعد کی مرصع اور پر تکلف کتابوں پر ترجیح حاصل ہوجائے گی۔ اور خود اس وقت بھی اس کے آثار پائے جاتے ہیں۔ آج کل فسانۂ عجائب کو وہ مقبولیت حاصل نہیں جو باغ و بہار کو ہے۔

خلیل علی خاں کا طرز بیان نہایت سلیس اور بے تکلف ہے۔ انھوں نے میر امن اور شیر علی افسوس کی طرح دہلی کے ٹھیک محاورں اور روزمرہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا بلکہ سنجیدہ عبارت آرائی کی ہے۔ زبان میں گھلاوٹ بھی ہے اور سادگی بھی۔ ہندی اور فارسی کے الفاظ کا استعمال نہایت مناسب تناسب کے ساتھ رکھا گیا ہے۔۔ مولوی اکرام علی مولف اخوان الصفا کی طرح زبان میں روانی اور صفائی بے حد ہے۔ کوئی فقرہ ضرورت سے زیادہ طویل نہیں معلوم ہوتا۔ بعض الفاظ جو اب متروک ہو گئے ہیں اس میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مگر اُن کے دیگر معاصرین کے مقابلہ میں رشک کے ہاں ایسے متروکات کی مقدار بہت تھوڑی ہے۔ بعض جگہ فارسی ترکیبیں اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی رکھے گئے ہیں۔ مگر ایسی طویل کتاب میں انکا استعمال بُرا نہیں۔ اس سے بجائے مصنوعیت پیدا ہونے کے اصلیت کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔

امیر حمزہ کی داستان اردو ادبیات میں عجیب اہمیت رکھتی ہے۔ پہلے ہی یہ قصہ چار جلدوں میں لکھا گیا تھا۔ منشی محمد حسین جاہ اور منشی احمد حسین قمر نے اس کے مضمون کو حوالت دیگر در حاشیے چڑھاکر طلسم ہوش ربا کی کئی جلدیں تیار کیں۔ پھر دوسروں نے اس سلسلہ کو اور آگے بڑھایا اور اپنے شبدیز قلم کی جولانیوں سے طلسم ہفت پیکر، طلسم نوخیز جمشیدی، ایرج نامہ، اختر نامہ وغیرہ خدا جانے کتنے ناموں سے اس سلسلہ کی جلدیں تیار کیں۔ غرض انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (قاموس العلوم برطانیہ) کی طرح اس سلسلہ کا ایک اچھا خاصہ کتب خانہ ہوگیا۔ اور داستان پسند پبلک کی ضیافت طبع کے لئے اتنا وافر ذخیرہ جمع ہوگیا کہ عمر کا بہت بڑا حصہ اس کے مطالعہ کی نذر ہوجائے۔

قصہ امیر حمزہ کے رجال داستان میں عرب و عجم کی مشاہیر ہستیوں کی عجیب آمیزش ہے۔ ایک طرف امیر حمزہ، عمرو عیار او مقبل کی سیرتیں عربی ہیں تو دوسری طرف بزرجمہر، بختک، قباد اور نوشیرواں وغیرہ خالص ایرانی ہیں۔ پھر تاریخی اور افسانوی شخصیتوں کو عجیب انداز سے مدغم کیا گیا ہے۔ بعض رسمیں اور طریقے خالص ایرانی ہیں جن سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ قصہ ابتداً فارس ہی میں تصنیف ہوا تھا جیسے اڑتے ہوئے پرندوں میں سے کسی خاص پرندے کو تاک کر تیر مارنا اور اگر تیر اس کے لگے تو اس سے اپنے مقصد میں کامیابی و موافق مرام نتیجہ نکلنے کی فال لینا جس کو فال گوش کہتے ہیں، خالص ایرانی دستور ہے۔ مگر اس کے علاوہ ساری داستان میں بہت سی باتیں خالص ہندوستانی بھی ہیں۔ جن سے صاف طور پر ثابت ہے کہ اردو میں منتقل کرتے وقت مترجم کے مبلغ نے یہ اضافے کئے ہیں۔ اور اصل قصہ

کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ مثلاً مدرسہ میں عمرو عیار کی شرارتوں کی جو تفصیل دی ہے وہ سب ایسی شرارتیں ہیں جو نہ صرف ہندوستانی طلبہ میں پائی جاتی ہیں بلکہ خاص اسی ملک کی چیزیں ہیں مثلاً عمرو عیار ایک مرتبہ نوشدارو حاصل کرنے کے لئے مداین جاتا ہے اور وہاں اپنے آپ کو گاؤں کا باشندہ بتاتا اور نوشیرواں سے دیہاتی زبان میں گفتگو کرتا ہے۔ اس موقع پر قصہ نویس نے جو زبان استعمال کی ہے وہ صوبۂ اودھ کے ایک گاؤں کی ہے۔ عمرو عیار کا ایک دفعہ سمندر میں کشتی سے کود پڑنا اور پھر ساحل پر اترتے ہی تسمہ پا اشخاص کا نظر آنا یہ ٹکڑے الف لیلہ سے ماخوذ ہیں۔ اسی طرح سراندیب کے بادشاہ لندہور سے لڑنے جانے سے قبل امیر حمزہ کا محل نوشیرواں میں بلایا جانا اور اُن کی اس شرط پر کہ فتح و کامیابی کے بعد مہرنگار دختر نوشیرواں سے انکا عقد کر دیا جائے، اُن کو شربت پلانا اور پان کی گلوریاں دینا خالص ہندوستان کی رسمیں ہیں جن کو ایران سے کچھ علاقہ نہیں۔ قصہ نویس نے القش وزیر کے اس تخت کی ساخت کا تخیل جو اُس نے بادشاہ قباد کے لئے بنایا تھا، شاہجہاں کے تخت طاؤس سے لیا ہے۔ غرض پوری داستان میں ایسی بیسیوں باتیں ہیں جن سے بخوبی واضح ہے کہ یہ مترجم کے حواشی ہیں اور اس نے اس واقعہ کو اپنا لیا ہے۔

یوں تو اس قصہ کے اکثر و بیشتر رجال داستان میں فوق العادت اور بعض مرتبہ خلاف عقل باتیں بھی دکھائی گئی ہیں مگر ساری داستان میں سب سے زیادہ اہم کردار عمرو عیار کا ہے۔ عمرو عیار اس قصہ کی جان دم کز ہے۔ اس کے کردار میں عجیب عجیب گل کاریاں کی گئی ہیں اور اُس کو ایسا چالباز، زرطلب اور دم باز دکھایا گیا ہے کہ اس کے آگے یورپ کے ازمنۂ وسطے کے جنگجو نایٹ اور اڈونچرر کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ مگر اس کے کردار میں شروع ہی سے بری خصلتیں اور طمع و چالبازی کے عناصر شامل کر کے اسکو نکی سے دور بتایا ہے غرض اس "سردار عیاران" سے ایسے ایسے کارنامے منسوب کئے گئے ہیں کہ عقل انسان سے باہر ہیں۔

ذیل میں ہم ایک ہی مضمون کے متعلق اشک اور تصدق حسین دونوں کے نسخوں سے ایک ایک بیان نقل کرتے ہیں۔ ان دونوں میں وہی فرق ہے جو اصل اور نقل، اصلی پھول اور کاغذی پھول میں ہوتا ہے۔ ایک سرتاپا صفائی، سادگی اور اصلیت کا نمونہ ہے تو دوسرا بالکل مرصع مسجع، پُر تکلف اور مصنوعیت کا مظہر ہے۔

حکایت:۔ یہاں سے دو کلمہ داستان ملک القش کے ملاحظہ فرمائیے جبکہ وہ باغ تیار ہوا۔ ایک دن بادشاہ کے حضور میں عرض کی۔ غلام نے ایک باغ حضور کی بدولت بنایا ہے اور بندہ امیدوار ہے کہ ظل سبحانی وہاں رونق افروز ہو کر ایک چمچہ آش نوش جان فرمائیں کہ باعث اعزاز خانہ زاد ہے۔ مصرع: شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا۔ فرمایا کیا مضائقہ ہے تم جاکر تیاری کرو ہم بھی آتے ہیں۔ القش حضور سے رخصت ہو کر واسطے تیاری کے آگے گیا۔ بعد اس کے جانے کے بادشاہ بھی زمرد کے تخت پر سوار ہو کر اور تمام وزرا و امرا ہمراہ لیکر طرف باغ بیداد کے رونق افروز ہوئے۔ جبکہ سواری قریب باغ کے آئی ملک القش نے ایک تخت ہوا دار واسطے بادشاہ کے ایسا تیار کیا تھا کہ اس میں گل اور بوٹے لعل اور الماس کے تھے۔ اور چاروں کونوں پر اس کے چار طاؤس زمرد کے بنائے تھے کہ جنھوں کے پیٹ میں لخلخے

خوشبو کے رہتے تھے اور واسطے تخت کی شان کے طاؤس کے پہلو میں دونوں طرف ایک ایک نرگس دان رکھا تھا کہ جن کے کونے مرصع کے مثل زمرد سبز تھے۔ اور الماس کے پھول جھنوں کی زردی پکھراج کی سی تھی۔ اس کو معہ ہودجوں اور چالیس ہاتھیوں جن پر جھولیں زربفت کی پڑی ہوئیں اور عماریاں کارزری وجواہر نگار اُنھوں کی پیٹھ پر کسی ہوئیں اور دو سو گھوڑے عربی، عراقی، ترکی، تازی معہ جواہر مرصع، ترکی اونٹ بغدادی کے دوکوہانی کہ جن کے کجاؤں پر کارچوبی زربفت کی چادریں کسی ہوئیں اور کتنے خیمے اور کتنی کشتیاں سلاح کی اور جواہرات کی اور پارچہ جات سوتی اور ریشمی اور پشمینے اپنے ساتھ لے اور باہر کے جلوخانہ تک استقبال کرکے بادشاہ کو یہ سب نذر گزرانا اور تخت کا پایہ پکڑ کر بوسہ دیا اور ہمراہ ہوا۔ جبکہ بادشاہ اندر باغ کے گئے دیکھا تو واقعی عجب گلزار ہے کہ شاید اور کہیں ایسا نہ ہوگا۔ اس کی وہ چار دیواری سنگ مرمر کی جس میں تمام فیروزے کی تحریر اور طرح بہ طرح کی بیل ہے اور نیچے ان دیواروں کے ہر طرف سنہری چوبوں کی دار پشت بنی ہوئی کہ اس میں پتے زمرد کے اور اور خوشے موتیوں کے لگے ہوئے ہیں۔ اور وہ صاف روشنی، سبزہ کا عالم، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، پھولوں کی خوشبو ہر دم جس سے دماغ کو قوت ہوتی تھی۔ کیاریاں اقسام اقسام کی گلزار اور ہر قسم کے پھول جن میں پھولے ہوئے مثل گل لالہ، نافرمانی، بابونہ، گیندا، جوئی، سوسن، چنبیلی، موتیا، موگرا، رائے بیل، گلاب، سیوتی۔ گلنار، گل مہدی، گل شبو، نرگس، داؤدی، ہر ایک طرح کی بہار تھی۔ اور دونوں طرف روش کے دو بڑے پیڑ چمپا اور مولسری کے بہت خوبصورت پھولے جن کی تمام ٹہنیوں پر اور شاخوں پر غرارے اور بادلے چڑھے ہوئے۔ وہ مہدی اور رائے بیل کی ٹہنیوں پر شان، وہ چوپڑ کی نہر مثل لوح الماس بلب، پانی کے ہر چہار طرف گئی کہ جن کے فواروں پر ہزارہ کی جا طوطے، بلبل، فاختہ، مور عندلیب جواہرات کے بنے ہوئے کہ جن کے پروبال سے ہزارہ چھٹتا ہوا ایک لطف دیتا تھا۔ اور سفید عالم عمارت کا کہ جس میں سنہری روپہلی الماس تراش استادوں پر تمام تمامی کے سائبان کھنچے ہوئے کہ جن میں سراسر موتیونکی جھالر تھی۔ اور سونے کی تھیلیوں چلمنیں مینا سے رنگی ہوئیں۔ پوئی داروں پر کلابتوں کی ڈوریوں کی زربفت کے پردوں کے ساتھ بندھی ہوئی غرض بادشاہ اس باغ کو دیکھکر اپنے باغ کو بھول گیا۔ (قصہ میر حمزہ از اشک صفحہ ۷) +

نخلبندان بوستانِ اخبار چمن پیرایانِ اظہار تختۂ کاغذ میں اس طرح اشجار الفاظ موقع موقع پر نصب فرماتے ہیں صحن شفافِ قرطاس کو گل دریا میں مضامین رنگارنگ سے یوں رشک تختۂ ارژنگ بناتے ہیں کہ جب باغ بیداد تیار ہوا نمونۂ بہشت نمودار ہوا۔ النقش خوشی سے پھول گیا فکر دارین بھول گیا۔ فرطِ مسرت سے پھولا نہ سماتا تھا۔ جامۂ تن سے باہر ہوا جاتا تھا۔ بادشاہ کی خدمت میں عرض کی کہ غلام نے حضور کی بدولت واقبال ایک باغ تیار کیا ہے۔ انواع انواع کے درخت ثمر دار اور گل بوٹے کے لگائے ہیں۔ دور دور سے بہ صرف زر کثیر نادر نادر درخت منگوائے ہیں۔ باغبان نادر کار نخلبندی میں ہوشیار بہم پہنچائے ہیں۔ ہزار ہا روپے صرف کرکے سیکڑوں استادان فن کے بلوائے ہیں۔ ہر ہر شخص یکتائے زمانہ ہے۔ اپنے اپنے ہنر میں یگانہ ہے۔ بیل بوٹے ایسے لگائے ہیں کہ مانی و بہزاد اپنی صفت سے شرمائے ہیں مگر جان نثار کی نظروں میں سماتا نہیں۔ خزاں کا رنگ باغ میں معلوم ہوتا ہے۔ جب تک ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی کا قدم مبارک اس میں جاتا نہیں۔

ناسخ:-
سرسبز ہو جو سبزہ تیرا پامال ہو　　　ٹھہرے تو جس شجر کے تلے وہ نہال ہو

امیدوار ہوں کہ حضرت خاقانِ جہاں نوشیروانِ زماں بطریق گل گشت کبھی اس طرف توجہ فرمائیں۔ خانہ زاد موروثی کا رتبہ فلک اعظم تک پہونچائیں۔ حضرت کے قدموں کی برکت سے باغ میں بہار آجائے ہر گل و غنچہ اپنا اپنا رنگ دکھائے۔ از راہ غلام نوازی اگر دو ایک میوہ نوشِ جاں فرمائیں غلام کو ثمر مراد حاصل ہو۔ اشجارِ امید بار لائیں۔ بادشاہ نے اس کے التماس کو قبول فرمایا۔ معروضہ اس کا درجۂ اجابت میں لایا النقش نے تسلیم بجالاکر نذر گزرانی۔ رخصت ہوا۔ باغ میں آکر سامان دعوت کرنے لگا۔ آناً فاناً سب اسباب ضیافت کا مہیا ہوگیا۔ اقسام اقسام کے کھانے تیار ہونے لگے طرح طرح کے میوے کشتیوں میں چنے گئے۔ ارباب نشاط کی حاضری کا حکم ہوا۔ آتش باز دل نے آتش بازی چھوڑنے کا موقع ڈھونڈ رکھا۔ روشنی کا سامان ہونے لگا۔ ہزارہا گلاس چڑھ گیا۔ جھاڑ فانوس دیوار گیریاں صاف ہونے لگیں موم کا نوری شمعیں چڑھائی گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد بادشاہ جمجاہ فلک رفعت خورشید طلعت داد گر انصاف پرور مع ارکان دولت داعیان سلطنت بہار افزائے باغ بیدا رہوا۔ النقش کا شجر مقصود بار لایا۔ (داستان امیر حمزہ از تصدق حسین صفحہ ۱۵)

اشک کے نسخہ سے اوپر ہم نے جو حکایت نقل کی ہے وہ انکی رنگیں بیانی کا بہترین نمونہ ہے اور ساری کتاب میں اس سے زیادہ مرصع اور رنگین کوئی بیان نہ ملیگا۔ مگر تصدق حسین کے نسخہ سے جو عبارت نقل کی گئی ہے ہم نے قصداً اس پر اکتفا کیا اور یہ بھی طویل ہے۔ اس کے بعد تخت اور باغ کا جو نقشہ انھوں نے کھینچا ہے وہ اتنا طویل ہے کہ ہم کو بخوف طوالت ترک کر دینا پڑا۔ اس کی رنگینی و آرایش کے لئے یہ کہنا کافی ہے مصرع

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

اشک کا دوسرا اور قابل قدر کارنامہ "واقعات اکبر" ہے۔ انھوں نے ۱۸۰۹ء میں کپتان ولیم ٹیلر کے ایما سے علامۂ ابو الفضل کی مشہور کتاب اکبرنامہ کا اردو میں اس نام سے ترجمہ کیا تھا۔ یہ بدقسمتی سے شائع نہیں ہوا۔ یورپ کے بڑے بڑے کتب خانوں میں بھی اس کا قلمی نسخہ یا مسودہ موجود نہیں ہے۔ اکبرنامہ جیسی اہم اور مفید کتاب ہے اُس کے اظہار کی ضرورت نہیں ہم نہیں کہہ سکتے کہ اشک کا ترجمہ دست برد زمانہ سے محفوظ ہے یا نہیں۔ اگر یہ کتاب دریافت و شائع ہو جائے تو ہمارے تاریخ کے سرمایہ میں ایک بیش قیمت اضافہ ہوگا۔

خلیل علی خاں کے تخلص اشک سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ضرور شاعر ہوں گے اور اس زمانہ میں شاعری کا گھر گھر چرچا بھی ان کے شاعر یا ناظم ہونے کا خیال پیدا کرتا ہے۔ اول تو ان کا ذکر ہی کسی تذکرہ میں نہیں۔ پھر انتخابی اشعار ملیں تو کہاں سے۔ اُن کا کوئی دیوان نہیں جس سے دو چار شعر مل سکیں قصۂ امیر حمزہ میں کہیں کہیں ایک آدھ انکا طبعزاد شعر مل جاتا ہے۔ مگر وہ انکی شاعری کا کوئی اچھا نمونہ نہیں ہو سکتا۔ اتنا ضرور ہے کہ وہ بہت ہی پست درجہ کے شاعر تھے۔ ہم اُن کو زیادہ سے زیادہ ناظم یا قافیہ پیما کہہ سکتے ہیں۔ انکا یہ حال معلوم ہوتا ہے کہ تفنن طبع کے طور پر کبھی کچھ کہہ لیا اور کسی موقع پر قافیہ پیمائی کر دی۔

سید محمد قادری (حیدر آبادی)

نبردِ عشق

-:(فسانہ):-

-:(۱):-

مس بہار کی یونیورسٹی میں آج پہلی تقریر تھی۔ سامعین پر ایک وجدانی کیفیت طاری تھی ہر شخص ہمہ گوش بنا مبہوت بیٹھا تھا۔ الفاظ کی آمد۔ بیان کی سلاست آواز کا ترنم اور مقررہ کی صورت دل موہے لیتی تھی۔ ایک سیلاب تھا جو دلوں میں طوفان اٹھاتا عقل کے بند توڑتا بہا چلا جا رہا تھا اور سارے مجمع کی فہم و فراست تنکے کی طرح بے بس اس دھارے کے ساتھ تھی۔

پروفیسر رعنا بھی ایک گوشے میں بیٹھے سب کچھ سن رہے تھے۔ جب مس بہار ہاتھ جھکا کر کوئی خاص فقرہ ذرا زور دیکر کہہ دیتیں تو یہ گھبرا کر اپنے ہاتھ مونچھوں تک لیجاتے اور ان کے بال انگلیوں سے کھینچنے لگتے اور جب وہ مسکرا کر کوئی طنزیہ جملہ دوسری جماعت کے خلاف کہتیں تو اور لوگ تو ہنسی سے بیتاب ہو جاتے لیکن یہ جلدی جلدی اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھنے لگتے۔ اور اگر کبھی مقررہ کی نظر انکی طرف مڑ جاتی تو انھیں ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی کرن انکی آنکھوں کے اندر گھسی جاتی ہے اور یہ سراسیمہ ہوکر عینک اتار کر اسے رومال سے صاف کرنے لگتے۔ اور اسپر غور کرنے لگتے کہ تقریر میں شراب کی سی تیزی اور مدہوشی کیونکر پیدا ہو سکتی ہے۔ کہ سارے جسم میں ایک حرارت دوڑتی محسوس ہوتی ہے۔

ممکن ہے آپ کو انکی یہ حرکتیں انوکھی اور عجیب معلوم ہوتی ہوں لیکن اتنا یاد رکھئے کہ پروفیسر رعنا جوان و نا کتخدا ہی نہ تھے بلکہ فلسفی بھی تھے۔ انکے ہاں ہر چیز کے متعلق «کیوں؟» اور «کیسے؟» کی بڑی بھرمار تھی۔ وہ ہر امر کی کنہ دریافت کرنے پر تلے رہتے۔ حیات انسانی کا معمہ اُن کے لئے بہت ہی دلچسپ تھا۔ تخئیل و تصور کا ہر جزو ان کے پیش نظر تھا اور ممکن و واجب کے اسرار سے وہ اچھی طرح واقف تھے مگر وہ کسی شے لاعلم تھے تو وہ جذبات و حسیات کی دنیا تھی۔ اس کا بھی انھیں کتابی علم تو ضرور تھا لیکن ذاتی تجربہ نہ تھا۔ اور اس لئے وہ بندرہ روز سے جب سے کہ مس بہار اُن کے درجے میں داخل ہوئیں تو وہ بار بار یہی سوچتے کہ اس نو بہار ناز کے دیکھنے سے ان کے دل میں گدگدی سی کیوں محسوس ہوتی ہے۔ اور آخر اس نئی حس کا باعث کیا ہے؟ درجہ میں اور بھی لڑکیاں ہیں لیکن انکی وجہ سے یہ کیفیتیں کیوں نہیں پیدا ہوتی ہیں؟ اسی کو نظر نے کیوں انتخاب کیا اور اسی کی طرف دل کیوں کھینچتا ہے؟۔

آج بھی جبکہ تقریر کی روانی۔ فقروں کی برجستگی اور دلائل کی کثرت و مضبوطی۔ مخالفین کو موافق بناتی جا رہی تھی، تو وہ بھی غور کر رہے تھے کہ ان پر اس آواز کا خاص اثر کیوں ہے۔ اور وہ دوسرے پروفیسروں کی طرح، شاباش، کہنے اور تعریف کرنے سے کیوں عاری ہیں؟ وہ اسی اُدھیڑ بن میں گرفتار تھے کہ دفعتاً آواز رکی اور تالیوں سے سقف شگاف شور نے انھیں چونکایا۔ مقررہ کو بیٹھتے دیکھکر

اُن سے اپنی جگہ نہ بیٹھا گیا اور یہ اپنے کمرے میں چلے آئے اور پھر پچھلی غور و فکر میں ڈوب گئے۔

(۲)

پروفیسر رعنا پانی برسے۔ اولہ پڑے یا پتھر گرے۔ لیکن ٹھیک پانچ بجے شام کی تفریح کے لئے ضرور باہر جاتے۔ ہمسایہ انکی پابندی وقت سے اتنا واقف تھے کہ اکثر ان کے برآمد ہوتے ہی تیز و سُست رفتار گھڑیوں کی سوئیاں ٹھیک پانچ پر کر لیتے۔ اور اس لئے پروفیسر صاحب کو معلوم ہو یا نہ ہو۔ لیکن محلہ بھر اُنھیں گھنٹا گھر کہکر پکارتا تھا۔

جس طرح پابندی وقت اُن کی وضع میں داخل تھی۔ اسی طرح یہ بھی اُن کی عادت تھی کہ ہر فصل میں چھڑی ہی پر بھروسا کرتے۔ کبھی چھتری لیکر یا واٹر پروف، پہنکر باہر نہ نکلتے اکثر بھیگے اور بُری طرح بیمار بھی ہوئے بخار بھی آیا۔ نزلہ و زکام بھی ہوا۔ لیکن انھوں نے پروا نہ کی ضعیفہ ماں اور بوڑھی دایہ۔ دونوں سمجھاتے سمجھاتے عاجز آگئیں لیکن نہ ٹھیک پانچ بجے کی سیر بند ہوئی اور نہ بلا چھتری کے نکلنا۔

مگر یہ اس لئے نہیں کہ طبیعت میں ضد تھی بلکہ محض اس وجہ سے کہ دنیا کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کی طرف سے بے پرواہ تھے۔ اور پھر فلسفی۔ وہ کہتے کہ جتنی دیر میں ان باتوں پر غور کروں گا اتنی دیر میں فلسفہ کا کوئی بڑا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ خواہ مخواہ عادت کے خلاف کام کر کے اپنے دماغ کو پریشان کیوں کروں؟ پانی کا برسنا ضروری۔ دنیا کا میل دُھلتا ہے۔ درخت و سبزہ نکھر جاتا ہے۔ پھولوں میں تازگی آجاتی ہے اور چڑیاں چہک اٹھتی ہیں۔ پھر مجھے کیوں تکلیف ہوگی جسم کو شاید زحمت ہو۔ روح کو انبساط ہوتا ہے اور دماغ کو فرحت سو اُن کے آگے جسم کا خیال بے سود۔ نزلہ اور بخار کا ڈر سب بیفائدہ!

اس لئے لکچر کے دوسرے ہی دن ہمارا بے پرواہ وضع کا پابند پروفیسر صرف چھڑی ہاتھ میں لئے گھر سے نکلکر سیر کے لئے چل کھڑا ہوا۔

نہ سدہ بدہ کی لی اور نہ منگل کی لی   نکل شہر سے کر راہ جنگل کی لی!

ادھر آسمان پر ابر کے دیوتاؤں میں سے ایک کی شادی تھی۔ عالم کی تمام گھٹائیں۔ ڈھول تاشہ۔ دہل دمامہ بجاتی چلی آرہی تھیں ہموار راستوں پر یوں ہی تاریکی میں سرگرم خرام لیکن بھیڑ۔ کھا بچے سے بھری سڑکوں پر بجلی کی روشنی کام آتی ہے۔ سب کو جلدی اس کی کہ کسی طرح دلھن کے گھر پہونچکر دل کا بخار نکالیں اور ذرا سی چھیڑ چھاڑ پر گھڑیوں برس پڑیں۔ کہ اتنے میں دوسری طرف بادلوں نے بڑھکر خیر مقدم کیا۔ اور اس خوشی میں جو آپس میں گرم فقرے اور چست جملے چلے تو دونوں طرف قہقہہ پڑا۔ بارات کی آرائش لٹنے لگی اور آتشبازیوں کو آگ دکھا دی گئی اور انکے پھول مینہ کی صورت میں زمین کی طرف آنے لگے۔

پروفیسر رعنا نے گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھا اور پھر اپنے ہاتھ کی جانب۔ وہاں چھتری کی جگہ چھڑی ہی تھی۔ اسے ذرا مضبوط پکڑا کوٹ کا کالر بند کیا اور گھر کی طرف لوٹے۔ بوندیں آہستہ آہستہ تیز ہوئیں یہاں تک کہ پانی کی چادر گرنے لگی اور یہ سر سے پانوں تک بھیگ کر شرابور ہو گئے۔ رفتہ رفتہ راستہ پر بھی پانی کی زیادتی ہونے لگی۔ جوتوں کے تلے بھیگے۔ پھر سارا جوتہ ڈوبا پھر گٹھنوں گھٹنوں تک پروفیسر صاحب پانی ہی میں تھے۔ اب تو فلسفہ بھی ڈھلگیا اور منطق بھی۔ اور جسم ہی نہیں بھیگا بلکہ شاید روح بھی۔ اس لئے کہ پروفیسر صاحب کو مسرت کی جگہ تکلیف محسوس ہوئی اور انبساط کے عوض سردی۔

پھر تاریکی ایسی کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دیتا تھا۔ قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں۔ کئی مرتبہ گرے۔ عینک کہیں کیچڑ میں گر کر پھنس رہی اور چھڑی ہاتھ سے چھوٹکر کسی جانب بہ نکلی۔

خدا خدا کرکے دور سے کچھ روشنی دکھائی دی۔ اسیطرف کا رُخ کیا۔ تھوڑی دور چلنے پر بنگلہ ملا۔ غیرت کیچڑ سے زیادہ مضبوط قدم پکڑتی رہی۔ لیکن ضرورت نے سب کو دھکا دے کنارے کیا اندر داخل ہوئے برامدہ میں پناہ لی۔ صاحب مکان نے آدمی کی چاپ پائی۔ دروازہ کھول انھیں بغور دیکھا۔ مرد شریف سمجھکر بڑے تپاک سے پیش آئے۔ کپڑے بدلوائے اور کمبل اڑھاکر اندر کمرے میں بٹھایا۔ انگیٹھی میں آگ روشن کرا کے پاس رکھوائی اور چائے کیلئے آواز دی۔ ایک ماما چائے کا سامان لئے ہوئے آئی اور اُس کے پیچھے پیچھے مس بہار!

:- (۳) :-

پروفیسر رعنا فلسفی تو ضرور تھے لیکن جوان اور ناکتخدا بھی تھے فلسفہ تو ابھی دہلکر خس و خاشاک کی طرح سڑک کے میلے پانی میں بہا جارہا تھا۔ جوانی اور اس کی اُمنگیں ناکتخدائی اور اُس کے دور کرنے کی خواہش، جو ہمیشہ اس بارِ ثقیل سے دبی رہتیں، اُسوقت اُبھر کر سطح پر آگئیں اور پھر کمرے کی گرمی۔ کوچ کی لچک۔ لیمپ کا سُرخ فانوس فرش کا موٹا قالین اور سب سے زیادہ آگ کی قربت ٹھٹھری ہوئی اُبھی حیوانیت کو ہمت دلاکر آگے بڑھا رہی تھی۔ کہ اس کے ساتھ مس بہار کی آمد نے بھس میں چنگاری کا کام کیا اور یہ ایک مرتبہ گھبراکر کھڑے ہوگئے اور ذہن نے جو سب سے پہلا کام کیا وہ اس کی خوش پوشی کا اپنی بے سر و سامانی سے مقابلہ تھا اور اپنے چہرے پر بھیگے ہوئے پریشان بالوں کا اس کے رُخ گلنار پر کالی زلفوں کے پیچ سے تقابل تھا۔ اور یہ جلدی جلدی ایک ہاتھ سے کمبل سمیٹنے لگے اور دوسرے ہاتھ سے اُلجھے ہوئے بالوں کو کو برابر کرنے لگے۔

وہ بھی اُن کو کمبل میں اس طرح لپٹا لپٹایا دیکھکر پہلے تو کچھ جھجکی۔ پھر بچا کر منہ پھیر کر مسکرائی صاحب خانہ متبسم آگے بڑھ کر بولے "پروفیسر صاحب یہ اس گھر کی بہار۔ میری سالی ہیں"۔ وہ جھمککر بولی "آپ کے تعارف کرانے کا شکریہ۔ لیکن پروفیسر صاحب مجھکو جانتے ہیں۔ میں اُن کی شاگرد رہوں۔ ہاں شاید آپ کو نہ جانتے ہوں گے۔ یہ حضور شمیم۔ ڈاکٹر شمیم ہیں اور جس گھر میں جاتے ہیں اسے نیتھلین کی سی خوشبو سے معطر کردیتے ہیں"۔ پھر بہنوئی کی طرف مڑکر بولی اور آپ ڈاکٹر رعنا ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ہماری یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر ہیں"

ڈاکٹر صاحب ہنسکر بولے "اخاہ تب تو بڑا ہی لطف ہے۔ جہاں بہار ہو اور رعنا بھی اور اسی کیساتھ شمیم بھی تو سوکھے سے سوکھے منطقی کا غنچہ دل کھل جانا چاہئے"

پروفیسر رعنا نے کہا "لیکن اسوقت تو منطقی بھیگا ہے!"

ڈاکٹر صاحب ہنسکر بولے "جب خشکی ہی باقی نہ رہی تو مسرت و دلبستگی میں پھر کاہیکی کسر رہی؟"

سب ہنس ہی رہے تھے کہ دفعتاً پروفیسر صاحب کو کچھ یاد آگیا اور وہ متانت سے بولے "لیکن ان باتوں میں یہ تو بھول ہی گیا کہ مجھے گھر جانا ہے۔ وہاں سب منتظر ہوں گے"

ڈاکٹر صاحب نے آگے بڑھکر خاموشی سے دروازہ کھول دیا اُس غضب کی تاریکی تھی کہ اللہ اکبر۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ابر کے

دیوتاؤں کے ہاں شادی میں حبشیوں کا ناچ ہو رہا ہی سوای شور ہنگامے کے کچھ سنائی نہ دیتا تھا نہ تال ٹھیک نہ سر۔ بس جھماجھم کی آواز تو ذرا قرینے کی تھی ورنہ اور صدائیں ان کے خط و خال کی طرح بے قرینہ۔ بے ہنگام۔ بے ربط!

کواڑ کھلتے ہی ہوا کے ایک جھونکے کیساتھ اُن کے سر در کے پھول کمرے کے فرش پر بکھر گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے "مزید داخلہ کی گنجائش نہیں" کہکر دروازے بند کر لئے اور پروفیسر سے بولے دیکھی حضرت۔ اُن کی سینہ زوری جب یہ کمرے میں اس طرح گھسے آتے ہیں تو پھر آپ کو گھر تک کیسے جانے دیں گے؟"

پروفیسر رعنا کی ہمت مردانہ کو اُس سے ٹھیس لگی۔ وہ بولے "لیکن مجھے جانا ضروری ہے۔ میں گھر سے رات بھر باہر نہیں رہسکتا اور پھر ایسے موسم میں!"

ڈاکٹر صاحب مسکراتے ہوی بولے "کیوں؟ کیا بیوی تنہائی میں گھبرائیں گی یا بجلی سے ڈرتی ہیں؟

پروفیسر صاحب نے کہا "جی بیوی تو بحمدہ اب تک ہی نہیں ڈاکٹر صاحب نے کہا "اچھا تو آپکے ہاں ابھی بہار نہیں آئی!" اور پھر مس بہار کی شرمندہ صورت اور خشمگیں آنکھیں دیکھکر جلدی سے بولے "تب پھر کون پریشان ہونے والا ہے؟"

پروفیسر صاحب نے کہا "جی ضعیفہ ماں ہیں وہ پریشان ہونگی" اور ڈاکٹر صاحب کے "پھر؟" کہنے پر بولے۔

"مجھے جانا چاہیے!" ڈاکٹر صاحب نے تھوڑی دیر اور روکنے کا بہانہ نکالا اور بولے "اچھا تو گھر کی مالکہ سے اجازت لے لیجئے!" پروفیسر صاحب مس بہار کی طرف بڑھے تو وہ بولے "جی یہ تو بدقسمتی سے میری سالی ہی ہیں۔ گھر کی مالکہ تو میری بیوی اُن کی بہن نسترن ہیں۔ ان سے پوچھکر کیا کیجئے گا۔ یہ تو اس غلطی سے اور خفا ہو جائیں گی!"

پروفیسر صاحب نے جلدی سے یہ کہکر جھیپ مٹائی "جی تو بیگم شمیم کہاں ہیں؟ اُن کی تو زیارت ہی نہیں ہوئی!" ڈاکٹر بولے "اچھا تو تشریف رکھئے۔ میں انھیں بلائے لاتا ہوں" اور یہ کہتے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

—:(۴):—

دلوں میں جب محبت کا چور ہو اور تخلیہ و تنہائی ہو تو زبان بند ہو جاتی ہے اور گفتگو کا کوئی پہلو نہیں ملتا۔ سارے موضوع تمام مباحث دماغ سے چہرے کی سرخی کی طرح کافور ہو جاتے ہیں۔ بس کچھ دیر دز دیدہ نگاہیں ہوتی ہیں۔ کچھ سرد آہیں اور پیشانی پر بکھرے ہوے عرق کے قطرے سے سرنگوں موتی!

پروفیسر رعنا کا دل اپنے کو مس بہار کے قریب تنہا پاکر زور زور اچھلنے لگا۔ انھوں نے گردن اس طرح جھکالی جیسے اس کی حرکتوں کو بغور دیکھتے جاتے ہیں اور یہ پوچھتے جاتے ہیں کہ "کیوں؟ کیوں؟ یہ کیا ہے؟ یہ کون سا نیا انداز ہے۔ اس میں اضطراب کا ہیکا اور بیچینی کیسی؟"

یہ اسیطرح اپنے خیالات میں غلطاں و پیچاں تھے کہ بڑے زور کی کڑک ہوئی اور سارا کمرہ یکبارگی چمک اٹھا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے بجلی کہیں بنگلہ ہی میں گری اور مس بہار چیخکر اُن کے کوچ پر آکر گر پڑیں۔ نصف لمحہ یا اس سے بھی کچھ کم اِن کا جسم اس پھول سے مس ہو گیا۔ زلفوں کی شمیم نتھنوں کے ذریعہ دماغ میں جا بسی

پروانۂ فلسفہ کے پر وبال شمع عشق نے جلادئے۔ اور اُن کے دل میں درد ابنساط۔ خوف اور خواہش کا جام لبریز چھلکنے لگا۔ کانپکر اُٹھ کھڑے ہوئے اور معمولی انسانی ہمدردی بھی بھول گئے گھبراکر بولے "مجھے گھر جانا چاہئے۔"

وہ نرمی سے بولی "آپ کی خوشی۔ لیکن باجی سے مل لیجئے!"

اُنھوں نے کہا "انھیں کا انتظار کر رہا ہوں"

اُس نے پوچھا "تو میں بلالاؤں" انھوں نے کہا "ہاں" لیکن جب وہ اُٹھنے لگی تو جلدی سے بولے "نہیں بیٹھی رہئے!"

اُس نے ان کی طرف دیکھا اور پھر نگاہیں نیچی کرلیں۔ اس نظر نے انہیں ہمت دلائی۔ دل کڑا کرکے اُنھوں نے پوچھا "آپ بجلی سے بہت ڈرتی ہیں؟" وہ خجالت سے سر جھکاکر بولی "جی ہاں"

انھوں نے مسکراکر پوچھا "اور بجلی گرانے سے؟" اس کے چہرے کی طرف اتنی سرعت وکثرت سے خون دوڑ آیا کہ چہرہ گلنار ہوگیا لیکن سر اور جھکگیا۔ ان کی ہمت اور بھی بڑھی۔ جواب کے لئے اصرار شروع کردیا "کیوں صاحب اس کا جواب نہیں ملیگا؟"

اُس نے سر اُٹھایا۔ کچھ عجیب انداز سے۔ گردن کو جنبش دیکر چشم و ابرو سے خاص کام لیتی ہوئی بولی "میں آپ کی شاگرد ہوں" انھوں نے جواب کے ہلکے پہلو کو نظر انداز کرکے کہا "اُونھ شاگردی واستادی کا یہاں کیا ذکر۔ یہاں تو صاعقۂ حسن اور خرمن دل کی بحث ہے۔" وہ بولی "تو پھر کسی شے کے بیجا اور غیر فطری استعمال پر بازپرس کی گنجائش ہوسکتی ہے نہ کہ صحیح و باطل استعمال پر۔"

انھوں نے پوچھا "یعنی" وہ بولی "آفتاب کا فطری کام روشنی پہونچانا۔ چاند کی غائت جلتی ہوئی دنیا کو سیمابی چادر میں سلانا۔ مرد کا مقصد قوانین قدرت پر ظفریاب ہونا اور کمزور عورتوں کی غرض فاتح مردوں کو شکست دینا۔ ہمارے ناتوان ہاتھوں میں صرف ضعف ہی ایک آلہ ہے اور یہی ایک حربہ!"

یہ بولے "لیکن پھر بھی اس دیدہ دلیری اور اس بے دردی سے اس کا استعمال اور پھر اس پر یوں فخر!"

وہ مسکرائی اور آنکھیں نیچی کرکے بولی ہم نے تو معبد حسن سے جس طرح صاعقہ پایا ہے اسی طرح اسی سے لن ترانی بھی سیکھی لیکن جب بار بار کہنے پر بھی مردوں کی آنکھیں نہ کھلیں اور انہیں سجھائی نہ دے تو ہمارا کیا قصور؟"

پروفیسر صاحب نے سوال کو پھر شخصی اور ذاتی بنایا اور بولے "لیکن میں تو دو کی جگہ عینک لگاکر چار آنکھوں سے سب کچھ دیکھا کیا۔ پھر بھی آنکھوں میں خیرگی سی ہوئی اور اب تو بیہوشی سی ہے۔"

——— پروفیسر صاحب کی بات کا پہلو بدلکر بیساختہ مسکراکر بولی "اور پھر ایسی حالت میں یہ اصرار کے گھر جائینگے لیکن ہاں جب آدمی اپنے ہوش ہی میں نہ ہو تو پھر اُس کی بات کب گرفت کے قابل؟ اچھا ذرا کوچ پر بیٹھ جائیے۔ میں ہوش میں لانے کی کوشش کروں۔" یہ بھی کچھ لاجواب سے ہوکر مسکراتے ہوئے بیٹھ گئے وہ میز سے سگریٹ کیس اُٹھالائی۔ انہیں سگریٹ دیا اور دیاسلائی خود ہی جلائی اور ہاتھوں کے کٹوروں میں اسے بند کرکے انکے منھ کے قریب لے گئی انھوں نے سگریٹ نہیں سُلگایا بلکہ روشنی میں اُسکے نازک ہاتھوں کا تیز گلابی رنگ اور اُن میں سبز سبز رگوں کی دلفریبیاں دیکھنے لگا۔ اُس نے انھیں محو دید دیکھکر روشن دیاسلائی پھونککر گل کردی۔ اور جب اُنھوں نے قدرے استعجاب سے

اس کی طرف دیکھا تو اُس نے بڑی متانت سے دونوں ہاتھوں پر دیاسلائی کی ڈبیہ رکھکر ایک طرف بڑھادی۔ انھوں نے مسکرا کر پوچھا "کیوں۔ کیا اب دوسری دیاسلائی نہ جلائیگا؟"

وہ بولی "جی مجھے منظور نہیں کہ آپ علم سمدرک کا مطالعہ میرے ہاتھوں میں کریں !" انھوں نے بات بنائی اور کہا "نہیں۔ نہیں میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ ان ہاتھوں میں میری قسمت کا کیا فیصلہ لکھا ہے"

وہ شوخی سے بولی "تو بہت خوب۔ دوسری دیاسلائی جلائے دیتی ہوں۔ غور سے ملاحظہ فرمائیے اور یہ کہتے کہتے پھر دیاسلائی روشن کی اور کفِ دست کا فانوس بناکر۔ اُن کی طرف بڑھائی۔ انھوں نے ابکی سگریٹ پہلے جلالیا۔ پھر ہاتھ دیکھنے کو (؟) جھکے۔ اُس نے پھر دیاسلائی بجھادی اور روٹھے ہوئے بچوں کی طرح منہ پھلاکر بولی "ہونھ۔ دیاسلائی تو جلوائی سگریٹ جلانے کے لئے اور غرض بتائی ہاتھ دیکھنے کی !"

وہ بولے "وہی غرض تو آپ کی بھی تھی۔ اس لئے کہ تقدیر پر نہ آپ یقین رکھتی ہیں اور نہ میں !"

اُس نے کہا "لیکن میں تو مانتی ہوں !"

یہ چپکے سے بولے "ہاں؟ آخر کن باتوں میں؟" وہ رک کر بولی۔ "مثلاً موت و زندگی کے معاملے میں۔" انھوں نے پوچھا "اور"

اُس نے شرماکر گردن نیچی کرلی۔ اُن کا اصرار اور بھی بڑھا۔ وہ بولی "اور شادی بیاہ کے بارے میں" انھوں نے ہنسکر کہا "تو پھر تو ہاتھ ضرور دیکھونگا۔ یہ تو میرے مطلب کی بات ہے"

وہ شرم سے عرق آلود ہوگئی کہ اتنے میں ڈاکٹر صاحب مع اپنی بیوی کے آگئے اور ان کا پروفیسر صاحب سے تعارف کرکے بولے "دیکھتی ہو یہ اس طوفان میں گھر جانے کے لئے مصر ہیں"

وہ بولیں "یہ ناممکن ہے۔ دسترخوان چن دیا گیا ہے کھانا حاضر ہے۔ اول طعام بعدہٗ کلام" انھوں نے پھر ماں کا نام لیا۔ تو مس بہار نے بڑھ کر کہا۔ یہاں ٹیلیفون موجود ہے اور آپ کے ہاں بھی یقینی ہوگا۔ انھیں اطلاع دیدیجئے کہ اس آفت میں آپ آنے سے رہے"

یہ بولے "ہاں یہ صورت معقول ہے" اور جلدی جلدی ٹیلیفون دیا۔ وہاں غریب ماں پریشان ہورہی تھی کہ اطلاع ملی اور یہ جاننے کہ ایک گھر میں آرام سے موجود ہیں مطمئن اور خوش ہوکر بولیں "وہیں رات بھر رہجانا۔ اس آفت میں آنے کا قصد نہ کرنا"

اُنھیں جب اس طرح بطیب خاطر اجازت ملی تو پھر میزبان سے بولے "بن بلایا مہمان حاضر ہے۔ اب جو حکم ہو"

بیگم شمیم نے کہا "تو پھر آیئے کھانا ٹھنڈا ہورہا ہے"

(۵)

کھانا کھانے کے بعد تاش کی ٹھہری۔ ڈاکٹر صاحب کا جوڑہ تو سلامتی سے موجود ہی تھا۔ اُن کی ساتھی مس بہار بنیں۔ یہ آکسفورڈ اور کیمرج کے برج کھیلے ہوئے۔ خوب خوب جیتے۔ اور ہارے ہوئے حریف ہنس ہنسکر اُن سے یہ فن حاصل کرتے رہے۔ کھیل کے اثنا میں ڈاکٹر صاحب اور اُن کی سالی میں گرم گرم فقرے ہوا کئے لیکن انھوں نے اپنا کام دور کا جلوہ رکھا۔ اور چپکے چپکے لطف لیتے رہے۔ اور دل ہی دل میں مس بہار کی ذہنیت و ذکاوت کی

داد دیتے رہے۔

گھنٹہ دو گھنٹہ اِس لطف سے کٹا پھر یہ طے ہوا کہ مس بہار کوئی چیز پیانوں پر بجا کر سنائیں۔ پروفیسر صاحب فطرتاً گانے کے عاشق تھے۔ اور خود بھی اس فن میں دسترس رکھتے تھے۔ پیانوں کا چھڑنا تھا کہ بیتاب ہو گئے۔ کمرے میں ٹہلنے لگے اور مس بہار کی موقع موقع سے داد دینے لگے ڈاکٹر صاحب اور انکی بیوی اُن کے چہرے سے بھانپ گئیں کہ یہ بھی اس فن سے اچھی طرح واقف ہیں اور اسپر مصر ہوئے کہ یہ خود بھی کچھ گائیں۔ انھوں نے پہلے تو انگریزی گانے گائے پھر سرور اور بڑھا۔ بھاشا اور اردو کی چیزیں گانے لگے۔ فن پر قدرت۔ آواز میں گداز۔ داغ دہلوی کی غزلیں۔ اور پھر موسم یہ کہ کالی گھٹا ہے پانی برس رہا ہے۔ رات کا وقت ہے اور ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ حالت تھی کہ آپے سے باہر ہوئے جاتے تھے اور سب کی نظریں بچا کر اپنی بیوی کی طرف اس طرح دیکھتے کہ وہ شرما شرما جاتیں۔ مس بہار ایک کونے میں علٰحدہ جا کر بیٹھی تھیں لیکن چہرے کی یہ حالت تھی کہ ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ غریب چھوٹے ریشمی رومال کی شامت تھی۔ کہ کبھی مٹھیوں میں دبا کر گیند بنایا جاتا تھا۔ کبھی دونوں ہاتھوں میں اینٹھکر مارپیچاں کی صورت اختیار کرتا اور کبھی اُس کے گوشے دانت سے دبا کر کھینچے جاتے۔

بارے یہ ہیجانی کیفیت پروفیسر صاحب کے گانے کے رُک جانے سے ختم ہوئی۔ اب ان کے دل کا بوجھ بھی کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔ اور رات بھی اچھی طرح بھیگ چکی تھی۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ اب "شب بخیر" سہی کہ لینا زیادہ اچھا ہے اور دونوں مہوشوں سے رخصت ہو کر پروفیسر صاحب ڈاکٹر صاحب کی ہمراہی میں اس کمرے کی طرف چلے جسمیں اُن کے سونے کا انتظام کیا گیا تھا۔

انھوں نے ڈاکٹر صاحب کی مہمان نوازیوں کا شکریہ ادا کرتے وقت ان سے کچھ رک رک کر کہا "اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی ماں کو۔ آپ کی بیوی اور سالی سے ملنے کے لئے لے آؤں؟"

وہ بولے "عزت افزائی۔ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے"۔

پروفیسر صاحب نے کہا "ہاں۔۔ مجھے صرف اس کا خیال ہے کہ وہ پرانی ریت اور رسم کا خیال رکھنے والی پردہ کی پابند ہیں!"

ڈاکٹر صاحب نے ذرا سا منہ بنا کر کہا "یہ تو دقت ہے ..... لیکن خیر میں اسوقت اندر نہ جاؤنگا۔ آپ ضرور لائیں"۔

پروفیسر صاحب نے کہا "بہت خوب۔ آپ گھبرائیں نہیں میں اُنھیں سمجھا دونگا وہ آپ حضرات پر کوئی اعتراض نہ کریں گی"۔

ڈاکٹر صاحب نے متانت سے کہا "ہاں صاحب۔ ان پرانے خیال کے لوگوں سے یہی ڈر لگا رہتا ہے ..... میرے تو یہی سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ سا تعلیم یافتہ اُن کے ساتھ کیونکر زندگی بسر کر لیتا ہے"۔

پروفیسر صاحب مسکرا کر بولے "بہت ہی آسانی سے اور خوشی خوشی۔ اس لئے کہ میرے اور ان کے خیالات میں تصادم کا خوف ہی نہیں!"

وہ بولے "اچھا تو پھر آپ بھی پردہ کے موافقین میں سے ہونگے ———— لیکن آپ ایسے فلسفی سے بہت بعید ہے"۔

پروفیسر صاحب نے کہا "اگر آپ میری بات توجہ سے سنیں اور اسپر غور کرنے کا وعدہ فرمائیں تو میں عرض کردوں"۔ ڈاکٹر صاحب نے

کہا "ضرور ضرور ارشاد فرمائیے"

انھوں نے متانت سے کہا "میرا خیال یہ ہے کہ جس طرح پوشاک ستر کے لئے ضروری ہے اسیطرح صنفی عریانیوں کے لئے پردہ۔ یہ ایسی عقلی قیود ہیں جن کی پابندی کیوجہ سے ہم میں اور حیوانات میں ایک امتیازی خصوصیت پیدا ہوگئی ہے اور ہم نے یہ حدیں اور یہ پابندیاں سیکڑوں برس کی آزادی کی زندگی بسر کرنے کے بعد قائم کی ہیں۔ یہ کہنا کہ ہمیں آزادی کی زندگی کا تجربہ نہیں بالکل غلط ہے۔ ہم نے بہت زیادہ آزاد زندگی بسر کی اور اس کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچے کہ ہماری یہ زندگی بالکل بہایم کی سی ہے اور اسی بنا پر ہم نے معاشرت کے چند اصول و ضوابط مقرر کئے اور اُن کی پابندی اپنے اوپر لازم کرلی۔ پردہ کی مخالفت وہی جماعت کررہی ہے جس نے آزادی کی حدوں کو حیوانیت سے ملا دیا ہے جنکے ہاں انسان اور بہایم سب ایک ہی صنف کی چیزیں ہیں۔ میں اپنے کو اشرف المخلوقات سمجھتا ہوں اس لئے میں اُن آزادوں سے اپنے کو علٰحدہ ہی رکھنا چاہتا ہوں" پروفیسر صاحب دم لینے کے لئے ذرا رُکے تو ڈاکٹر صاحب نے مغرب کا نام لیا۔ وہ مسکرا کر بولے "مغرب؟ جی میں نے کئی برس مغربی معاشرت کا بغور مطالعہ کیا ہے اور اس کے بعد مصر و عرب و ایران کی بھی سیر کی ہے۔ اور میں ذاتی تجربہ کے بعد کہتا ہوں کہ صنف نازک کی موجودہ آزادیاں عفت و عصمت۔ عزت و شرافت کی بنیادیں کھوکھلی کررہی ہیں۔ اور ایک دن اخلاقیات کی یہ ساری عمارت مسمار و منہدم ہوکر رہجائیگی بے حیائی و عریانی بہیمیت و حیوانیت۔ انسانی جامہ میں روز بروز نمایاں ہوتی جارہی ہیں۔ اور اگر ہندوستان بھی اسیطرح کورانہ تقلید پر مصر رہا تو چند ہی سال بعد ہندوستانی شریف عورتیں بھی عریاں ناچوں کا مقابلہ بہت خوشی سے منظور کریں گی۔ اور عجب نہیں کہ ہمارے ہاں بھی جرمنی کے نام نہادی فطرت پرستوں کی طرح شرفاء میں ننگا گروہ بہت جلد پیدا ہوجائے۔ سچ مانئے ہم میں نسلوں کا امتیاز حلال و حرام کے مدارج اور شریف و رزیل کا فرق اسیوقت باقی ہے جب تک کہ یہ پردہ باقی ہے ورنہ وہ خلط ملط ہوگا کہ اس تالاب میں سب ننگے ہی ننگے دکھلائی دیں گے!۔ آج جس شرافت پر ہمکو ناز ہے۔ کل اُسمیں شک ہوگا اور جو غیرت ہماری مخصوص شے ہے وہ بالکل مفقود ہوجائیگی!"

ڈاکٹر صاحب نے کہا "تو آپکے نزدیک پردہ اُٹھتے ہی ساری خرابیاں پیدا ہوجائینگی"

پروفیسر صاحب نے کہا "نہیں۔ یہ تو نہیں لیکن ننانوے فی صدی برائیوں کے موقع بڑھ جاتے ہیں۔ معاف کیجئیگا۔ اب جاکر آرام فرمائیے۔ پھر کبھی اسپر بحث ہوگی"

(۶)

صبح سویرے جب پروفیسر صاحب نے نماز سے فراغت پائی اور رات کے بھیگے ہوئے کپڑے زیب بدن کرکے کمرے سے نکلے تو انھیں سارا گھر سوتا ملا۔ انھوں نے جیب سے "فاؤنٹن پن" نکالا اور ایک پرزے پر یہ لکھ کر کہ "ڈاکٹر صاحب رات کی مہمان نوازیوں کا شکریہ۔ اب بندہ رخصت ہوتا ہے" وہیں میز پر رکھدیا اور سیدھے گھر چلے گئے۔ اور واں سے دیر تک اپنے میزبانوں کی تعریف میں رطب اللسان رہے۔ اور یونیورسٹی سے واپسی پر شام کو واں کو سبز گاڑی میں بٹھا کر ڈاکٹر صاحب کے بنگلہ پر

پہونچے۔ خود ڈاکٹر صاحب کے پاس علیحدہ بیٹھ گئے اور پردہ کرا کے اس ضعیفہ کو بیگم شمیم کے پاس بھیجدیا۔ مس بہار کہیں ٹینس کھیلنے گئی تھیں اس لئے ——— اُن سے ملاقات نہوئی

جب گھر لوٹے تو ماں نے بھی بیگم شمیم کی تعریف کی۔ دو تین روز کے بعد پھر ڈاکٹر صاحب کے پاس پہونچے اور اِدہر اُدہر کی باتیں کر کے کہنے لگے کہ "میں چاہتا ہوں کہ اگر آپ حضرات پسند کریں اور مس بہار میری ماں اور مجھے خوش کرنے کے لئے پردہ میں رہنا منظور کریں تو میں اپنے کو اُن کی غلامی میں دینا چاہتا ہوں"

ڈاکٹر صاحب کچھ متفکر سے ہو گئے۔ تھوڑی دیر سوچکر بولے "میرے نزدیک تو مس بہار قابل رشک ہیں کہ ان کو آپ کا سا کفو ملا لیکن یہ پردہ۔ شاید آپ دونوں کے درمیان حائل ہی ہو کر رہیگا" انھوں نے کہا "بہرحال آپ میرا پیغام پہونچا دیں۔ اس کے بعد جو میری قسمت" اور اُن سے رخصت ہو کر چلے آئے۔

آج طلباء آئے گئے۔ لکچر بھی دیا۔ پڑھایا بھی۔ لیکن جس کو آنکھیں ڈھونڈھتی تھیں وہ کہیں نہ دکھائی دی۔ گاڑی پر گھر بھی لوٹے مگر لیکن بادل ناخاستہ۔ راستہ بھر سوچتے رہے کہ دریافت خیریت کیلئے آج ہی ڈاکٹر صاحب کے ہاں جائیں یا نہ جائیں۔ دل کا چور قدم پکڑتا تھا۔ لیکن نظرت کی کشش یہی کہتی کہ بن دیکھے رات کیونکر کٹ سکتی ہے۔ عقل سمجھاتی کہ ابھی ——— ابتدا ہے ابھی سے روک تھام لازمی ہے ورنہ ساری دنیا بہار ہی ہو کر رہجائیگی۔ اور اُس کے سوا سب کچھ چھوٹ جائیگا سُوا گھٹتا۔ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔ غرض ایک طوفان تھا کہ اس فلسفی کے دل و دماغ میں برپا تھا۔ آندھیاں بھی آتی تھیں اور جھکڑ بھی۔ صرف برسوں کی منجی ہوئی طبیعت۔ اپنے کو لئے دئے رہنے کی عادت آڑے آتی جب جذبات میں تلاطم اُٹھتا تو وہ جھیل کے کنارے کے بید کے درختوں کی طرح لچک جاتی۔ جھک جاتی۔ لیکن جہاں اس طوفان میں ذرا سی کمی۔ تھوڑی سی کیفیت ہوتی وہ پھر اُٹھ کھڑی ہوتی۔ ہزاروں مرتبہ ہاری لیکن پھر اپنی جگہ پر موجود۔ سیکڑوں مرتبہ دب گئی اور پھر اُبھر آئی۔ نہ کسی طرح ٹوٹتی اور نہ جڑ سے اکھڑتی تھی۔ مقابلہ تھا کہ جاری تھا۔ جنگ تھی کہ بے دست و پائی میں بھی نہ رکتی تھی۔ اُس پر اُدھیڑ بُن کا سلسلہ گاڑی رکنے سے ٹوٹا۔ اترے اور اندر داخل ہوئے وہاں ایک خط ملا۔ لکھا تھا۔

"ڈیر پروفیسر صاحب۔ میں نے آپ کا پیام دونوں جگہ پہونچا دیا۔ میری بیوی تو آپ پر اسی رات سے عاشق ہیں۔ انھوں نے تو خوشی خوشی منظور کر لیا۔ لیکن صاحب معاملہ پردہ کے معاملہ سے بظاہر گریزاں ہے۔ جب میں نے آپ کی وکالت شروع کی تو اس نے مدعی سُست اور گواہ چست، والی مشہور پھبتی مجھ پر کسی اور چپ ہو رہی۔ آپ چاہے۔ اس کے معنیٰ السکوت کالاقرار سمجھیں لیکن مجھے تو تیور بتلاتے ہیں کہ "خموشی معنیٔ دارد کہ در گفتن نمی آید"۔ بہرحال آپ تشریف لائیں اور خود اپنے کانوں اپنی قسمت کا فیصلہ سُن لیں

"خیر اندیش شمیم"

پروفیسر صاحب خط پڑھکر آرام کرسی پر دراز ہو گئے دیر تک سگار پیا کئے اور یہی سوچا کئے کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ ڈاکٹر کا خیال صحیح ہے۔ جواب نفی میں ہے۔ کس سے رائے پوچھیں۔ کس سے مشورہ کریں۔ کوئی تجربہ کار ہو تو بتائے۔ کوئی عقل والا ہو تو اس پر بھروسا کیا جائے۔ جلدی سے اٹھے۔ کانٹ۔ اسپنوزا

ڈیکارٹ - ہیوم - بارکلے - سب کی کتابیں اُٹھا لائے - اُن کی ورق گردانی کرڈالی - سب اس موضوع پر خاموش - عقلِ کل لیکن جذبات سے معرا - خیال آیا شاید جیمس امریکہ کا رہنے والا زندہ دل تھا، اس کے ہاں کوئی کام کی بات ملے - اس کی کتاب اٹھائی - محبت کا بیان نکالا - حرف حرف پڑھ ڈالا - کوئی مشورہ نہ ملا - عاجز آکر سب پھینکدیا اور سر تھامے دیر تک بیٹھے سوچا کئے - پھر بچپن سے پڑی ہوئی عادت کام آئی - سیدھے ماں کے پاس پہونچے - انکی گود میں سر رکھ کر لیٹ رہے - اور سارا ماجرا کہہ سنایا - خط کا مضمون اپنی خواہش اور پردہ کی رکاوٹ - ضعیفہ نے سب کچھ اس طرح ٹھنڈے دل سے سنا جس طرح وہ اس وقت کی باتیں سنا کرتیں جب یہ پانچ سات برس کے تھے - اور ان کی خشک انگلیاں ان کے سر کے بالوں سے برابر کھیلتی رہیں - جب انھوں نے تتمہ کلام میں یہ کہا کہ "امی اب یہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں" تو اس نے مامتا سے کانپتے ہاتھوں سے انکا چہرہ کلیجہ سے ہٹا کر سیدھا کیا جھک کر دیر تک اِن کی آنکھوں میں کچھ دیکھا کی - عجب نہیں کہ اُن میں اس نے انھیں پالنے میں ہمکتے - ہاتھ پیر پھینکتے پھر ننھی ننھی ٹانگوں سے دوڑتے - پھر عنفوان شباب میں سبزہ آغاز - پھر جوانی میں پروفیسر کی حیثیت سے - پھر آج عاشق بے تاب کی طرح پریشان خاطر سب کچھ ایک ہی نظر میں دیکھ لیا ہو - اس لئے کہ ماں کی نظر میں بیٹے کی ہر صورت - ہر وقت یکساں طور پر موجود رہتی ہے -

بہر حال وہ تجربہ کار بی بی بولی "بیٹے یہ تمھاری ناتجربہ کاری ہے کہ تم اس قدر پریشان ہو - دل لگانا اور دل کا آنا تو دنیا میں عام ہے - اس میں کوئی بُرائی نہیں - ہاں پردہ کی رکاوٹ البتہ ...... لیکن ہمارے ہاں تو یہ رسم صرف بزرگوں ہی سے نہیں چلی آئی ہے بلکہ ایمان و شرافت کا جز ہے میری خواہش تو یہی ہے کہ جب چاند سی بہو گھر میں آئے تو وہ بھی شریفوں کے دستور کی پابند ہو --- لیکن میرے خیالات پرانے - میری عقل دقیانوسی میں آج کل کا طور طریقہ کیا جانوں - میرے ماں باپ نے بھی پڑھایا لیکن اردو - فارسی اور تھوڑی سی عربی - میں تم لوگوں کے خیالات کیا سمجھوں - میں تو عورت ذات تھی - میرا کیا ذکر - لیکن میرے میکے کے مردوں میں سے بھی کوئی نہ فرنگیوں سے ملا اور نہ فرنگیوں کے ساتھ اُٹھا بیٹھا - تم ماشاء اللہ تمام دنیا کی سیر کر آئے ہو سمندر پار ملکوں میں تم نے تعلیم پائی ہے تم ہمارے طریقے اور ہماری رسموں کی کہاں پابندی کر سکتے ہو اس لئے اگر تم کسی بے پردہ سے شادی کر دگے تو مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے - ہاں اتنی ضرور تمنا ہے کہ کسی کو بیاہ کے لاؤ - مگر شریف ہو - قوم و ذات کی شریف نہ سہی - لیکن افعال شریفوں کے ہوں - دل شریف کا ہو اور طبیعت شریف کی - ایسا نہ ہو کہ تمھاری بیوی اور میری بہو ہوکر تمھارے باپ کا نام ہنسوائے"-

پروفیسر صاحب اُٹھکر بیٹھ گئے اور ماں سے بڑی محبت سے بولے "امی میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو لیکن اس کا ضرور خیال رکھونگا؟"

وہ بولیں "اللہ تمھیں سلامت رکھے - اور تمھارے سر پر سہرا مجھے دیکھنا جلد نصیب ہو - اب تمھیں اختیار ہے جو جی چاہے کرو"

اُنھوں نے بالکل بچوں کے انداز سے پوچھا "تو پھر آج جاؤں؟"

وہ جہاندیدہ مسکرا کر بولی "نہیں بیٹا جلدی نہ کرو - میں نے

آج تک اُس لڑکی کو نہیں دیکھا۔ ذرا پہلے میں خود دیکھ آؤں۔ اُسکے بعد تم بھی چلے جانا۔"

یہ وہاں سے اُٹھکر باہر آئے۔ کوچبان کو گاڑی تیار کرنے کا حکم دیکر اپنے کمرے میں جاکر بیٹھ رہے۔

(۷)

بڑی بی نے واپسی پر صرف اتنا کہا کہ "بیٹا لڑکی ہر طرح اچھی ہے۔ لیکن طور طریقہ سارا فرنگنوں کا ہے۔" اور چپ ہو رہیں۔ جب اُنھوں نے بہت اصرار کیا تو ـــــ کہنے لگیں "بڑی تو آج پھر بڑے تپاک سے ملیں۔ اُن کے انداز سے تو صاف ٹپکتا ہے جیسے انھیں یہ بات دل سے منظور ہے چھوٹی بھی سلام کرکے قریب آکر تہذیب سے بیٹھی۔ لیکن ذرا سا نہ جھجکی نہ شرمائی۔ اگر اسے بھی منظور ہوتا تو یوں قریب نہ بیٹھتی۔ بیٹا بُرا نہ ماننا۔ وہ تم سے ابھی محبت نہیں کرتی۔ میں اتنی دیر کی ملاقات میں اتنا ضرور اندازہ کرسکی کہ اگر وہ تم کو چاہتی ہوتی تو وہ اس طرح کی لڑکی ہے کہ تمھارے لئے ایک پردہ میں کیا ہزار پردہ میں بیٹھنا قبول کرلیتی اور پھر جب میں نے اُسے دیکھا ہے تو ایک سُرخ انگریزی کپڑا پہنے تھی۔ گردن کے پاس سے کھلا ہوا۔ یہ ہندوستان کی کنواری لڑکیوں کا دستور نہیں۔ اُسپر سے ماشاء اللہ بنی سنوری بھی تھی۔ تم چاہے ہنسو یا اُسے بُرا کہو۔ لیکن ہمارے ہاں شرفا میں بن بیاہی لڑکیوں کو موٹا کپڑا پہناتے تھے۔ ایک تو اس لئے کہ خود پسندی نہ آئے۔ دوسرے اللہ جانے غریب سے بیاہی جائے یا امیر سے۔ اگر میکہ میں ریشم پہنتی رہے اور غریب شوہر کے پاس اتنا نہ ہوا تو پھر زندگی دو بھر ہو جائیگی یہاں ماشاء اللہ ابھی سے سب کچھ ہے۔ اب بیٹے جو تم انگریزی کپڑے نہ پہنا سکے تو پھر؟ ... مجھ بڑھیا کی اگر رائے مانو تو تم اس خیال کو اپنے دل سے نکال ڈالو۔ ابھی میرے گھر میں بہو آنا خدا کو منظور نہیں!"

یہ وہاں سے چپکے چلے آئے اور پلنگ پر آکر لیٹ رہے۔ ماں کا پاس۔ خاندانی روایات کا لحاظ۔ شرافت و غربت کا خیال ایکجانب حسن کی کشش۔ محبت کا جذب۔ مغربی تعلیم کا اثر۔ دوسری طرف۔ نتیجہ یہ تھا کہ ساری رات آنکھوں میں کٹی۔ کبھی اٹھے۔ کبھی بیٹھے کبھی ٹہلے۔ کبھی پھر لیٹ رہے۔ نیند نہ آنا تھی نہ آئی۔ ہاں مس بہار کی تصویریں تھیں کہ قطار در قطار ـــــ نئے نئے انداز سے چلی آتیں۔ کبھی تقریر کرتی ہوئی۔ زیر لب مسکراتی ہوئی کبھی سبق پڑھتی ہوئی۔ ایک خاص انداز سے گردن ٹیڑھی کئے۔ ہونٹوں پر پنسل کی نوک رکھے کبھی بجلی سے ڈرتی ہوئی زرد رو۔ کبھی بجلی گراتی ہوئی سرخرو۔ اور ایک دلربا۔ دلکش۔ دلآویز۔ عجیب معمہ اور طرفہ اسرار یہ تھا کہ آنکھ کھولے رہتے جب بھی دیکھتے۔ آنکھیں بند کرلیتے جب بھی دیکھتے۔ گویا ہر تصویر پردہ ہائے چشم پر ثبت تھی۔

صبح کے وقت جب موذن نے اذان دی تو یہ بھی الا اللہ کہکر اُٹھ کھڑے ہوئے اور نماز پڑھ کپڑے پہن چھڑی گھماتے چل کھڑے ہوئے اور پہونچے وہیں جہاں رات کی نیند تھی۔ بنگلہ میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ بہار گلگشت چمن میں مصروف ہے۔ انھیں دیکھتے ہی سلام کرکے بولی "رات آپ کی والدہ سے ملکر بیحد دل خوش ہوا۔ بہت ہی نیک پرانے طرز کی آدمی ہیں۔"

یہ بولے "آپ کی عنایت میں بھی اسوقت مخصوص شکریہ ادا کرنے حاضر ہوا کہ آپ نے کم از کم اُنھیں چھیڑا نہیں اور اُنھیں خوش ہی کرنے کی کوشش کی۔"

وہ بولی "سچ کہوں جی تو بیساختہ یہی چاہتا تھا کہ کوئی ایسی بات کہدوں کہ ذرا وہ اُلجھ جائیں۔ لیکن پھر آپکا خیال آگیا"

یہ بولے "میں اس کا اور زیادہ ممنون ہوں کہ میرا خیال تو آیا"

اس نے مسکرا کر کہا "کیوں اسمیں شکریہ کی کونسی بات ہے؟ پروفیسروں کا تو ہر روز سبق کے سلسلے میں خیال آ ہی جاتا ہے"

وہ بولے "میں آپکے بنگلہ پر شاگرد و استاد کی طرح باتیں کرنے نہیں آتا بلکہ دوستوں کی طرح"

اس نے بیساختہ جواب دیا "دوستی میں سن کا فرق جنس کا اختلاف۔ علم کی کمی و زیادتی۔ یہ سب امور مانع ہیں"

انھوں نے کہا ——— "لیکن محبت میں تو نہیں! عشق میں تو یہی اختلافات جذب وکشش کی زیادتی کا باعث ہوتے ہیں"

وہ بولی "ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن اُسمیں بھی درجے ہوتے ہیں ......"

انھوں نے جلدی سے بات کاٹکر کہا "بس اسی سے سمجھ لیجئے کہ میری محبت کس درجہ کی ہے کہ میں آپ کی غلامی میں آنے کیلئے تیار ہوں"

وہ مسکرا کر بولی "آپ کی عنایت و محبت کا شکریہ۔ لیکن وہ تو کچھ شرطوں پر مبنی ہے۔ انھیں شاید آپ بھول گئے"

انھوں نے کہا "بہت معمولی سی۔ صرف اتنی سی بات ہے کہ علانیہ بے پردہ نہ نکلو بلکہ برقعہ پہنکر؟"

اُس نے کچھ منفعل ہو کر "ہوں!" کہا اور پھر پوچھا "اور کچھ؟"

انھوں نے کہا "بالکل نہیں!"

وہ تھوڑی دیر چپ چاپ چپ رہی جب انھوں نے کہا "کیوں بھئی کیا لائق جواب بھی نہیں؟ ہاں نہیں کچھ تو بولو!"

وہ ان کی طرف منہ پھیر کر بولی "اگر آپ سے دو چار ہفتہ میں نے تعلیم نہ حاصل کی ہوتی اور آپ کی قابلیت اور علمیت کی قایل نہ ہوتی تو شاید میں "چار پایہ برو" والا شعر پڑھدیتی۔ لیکن شاگرد ہونے پر بھی جب آپ منہ کھلواتے ہیں تو اتنا ضرور کہوں گی کہ آپ سی ذہنیت کے آدمی کو فلسفہ نہ پڑھنا چاہیے تھا۔ آپ کو عقلیات سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ محض رواسم کے پابند اور پرانی لکیر کے فقیر ہیں! ... میں اپنے کو ایک شخص کے اختیار میں دیکر اپنی زندگی برباد نہیں کرنا چاہتی!"

انھوں نے غصہ اور درد بھری آواز سے پوچھا "تو پھر یہ آخری جواب ہے؟"

اس نے کہا "بالکل! مجھے تو سخت تعجب ہے کہ جب میرے اور آپ کے درمیان کا اصولی اختلاف ہے۔ تو پھر آپ کے دل میں یہ خیال ہی کیونکر پیدا ہوا!"

وہ بولے "خیر۔ یہ تعجب تو آپ کا اُس وقت رفع ہو جائیگا جب آپ آئینہ سامنے رکھکر اپنی صورت پر غور کریں گی!"

اُس نے ترش روئی سے کہا "تو صورت تو کوئی ایسی چیز نہیں جسپر زندگی کی بنیادیں رکھی جائیں۔ دیکھئے پھر وہی فلسفیت کے خلاف بات!" وہ عجیب طرح جھنجھلا کر بولے "ارے تو میں مرد بھی تو ہوں جوان بھی تو ہوں۔ یا خالی فلسفی ہی؟"

اسپر وہ کنکھیوں سے انھیں دیکھ کر مسکرائی اور چپ ہو رہی۔ اور

پھر پھول چننے لگی۔

انھوں نے پوچھا ”تو بس جاؤں؟“ وہ بھویں اونچی کر کے متعجب آواز بنا کر بولی ”کیوں؟ کیا دولہ بھائی اور باجی سے نہ ملئے گا؟“ انھوں نے کہا ”نہیں...... اچھا خدا حافظ...... اور اگر فلسفہ اجازت دے تو دو چار پھول مجھے عنایت فرمایئے یادگار کی طور پر رکھ چھوڑوں گا“

اُس نے دو تین مرجھائے ہوئے پھول گود سے جھٹکر نکالے اور انہیں ایک طرف بہ ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے عمداً زمین پر گرا دیا۔ اور پھر ”ارے!“ کہکر انھیں اُٹھا کر انکی جانب بڑھایا۔ انھوں نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بند کر کے جیب میں رکھ لیں اور تعظیماً جھککر بولے:-

شکریہ! لیکن مرجھائے ہوئے بھی ہیں اور خاک آلود بھی رکھ چھوڑئے اور انھیں میرا دل سمجھکر پیروں سے کچل ڈالئے گا یہ کہتے۔ لانبے لانبے ڈگ رکھتے بنگلہ کے باہر نکل آئے۔ ادھر اُس نے پھولوں کی جانب دیکھا اور پھر اُن کی طرف نظر جمائے دیکھتی رہی۔ اور جب یہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تو واقعی اس نے ان بیگناہوں کو زمین پر ڈال کر پیر سے مسل ڈالا! اور پھر ساری ٹوکری وہیں بکھیر کر جلدی جلدی اپنے کمرے میں گئی اور اپنے پلنگ پر گر کر دیر تک پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی.......

اصول و محبت کی اس لڑائی میں بظاہر تو اصول کی جیت رہی لیکن فتح دراصل ہوئی محبت ہی کی اور آنسوؤں نے اُس مصحف رُخ پر آبِ زر سے جلی حرفوں میں لکھ دیا!“

(۸)

پروفیسر رعنا وہاں لوٹتے ہی سیدھے وائس چانسلر کے یہاں پہونچے اور ان سے ایک مہینہ کی رخصت لیکر رختِ سفر باندھ۔ اسی دن پہاڑ چلے گئے۔ اور وہاں پہاڑوں کی سختی انکی متانت اور ان کے استقلال و جبروت سے دو ہی چار روز میں پامردی کا سبق حاصل کر کے فلسفہ الٰہیات میں ڈوبے اور معشوق مجازی کا خیال ترک کر کے معشوق حقیقی کے حسن جہاں سوز کے مطالعہ میں مشغول ہو گئے اور اس بحث پر ایک مستقل کتاب لکھنا شروع کر دی شب کو دس بجے تک اور صبح تڑکے سے نو بجے تک لکھتے رہتے اور پھر سارا دن چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر چڑھنے کی کوشش میں صرف کرتے۔ غرض دماغی و جسمانی محنت نے دل کا درد اس طرح مٹایا کہ اب صرف داغ ہی داغ رہگیا اور بیچینی کی جگہ سکون اور اضطراب کے عوض تسکین عود کر آئی۔

ممکن ہے کہ اس کامیابی میں ماں کی دعا بھی شریک رہی ہو اس لئے کہ وہ ضعیفہ دن رات خالق سے اپنے بچے کے لئے صرف استقلال و پامردی ہی مانگتی، آخر ماں کی آواز جب اس طرح درِ اجابت کو کھٹکھٹائے تو کب تک شنوائی نہ ہو اور انکو بھی سوائے اس کے اور کام ہی کیا تھا۔ کھانا کھانا۔ نمازیں پڑھنا۔ یا بیٹے کے کپڑوں اور کتابوں کا الٹنا پلٹنا اور اُنھیں دہوپ دکھا کر صاف کر کے شکنیں مٹا کر پھر سلیقہ سے رکھدینا یہی روزمرہ کا کام تھا اور یہی زندگی کی غایت و غرض!

ہاں دو تین مرتبہ اس معمول میں کچھ فرق آیا اور وہ اس لئے کہ بیگم شمیم ملنے چلی آئیں بڑی بی اُن سے یا ان کی بہن سے کچھ زیادہ خوش نہ تھیں اور وہ بھی اُن کے بشرے سے یہ سمجھ ضرور گئیں اور جب انھوں نے پروفیسر صاحب کے متعلق پوچھا تو بڑی بی کے

جواب نے اس کی بالکل وضاحت کردی - وہ بولیں "بی بی وہ اپنے دل سے مردانہ وار لڑنے گیا ہے - اور سچ جانو میرا بچہ وہاں سے کامیاب لوٹیگا - وہ مرد بچہ ہے - اور خود بھی مرد ہے!" وہ بھی جی ہاں، کہکر بات ٹال گئیں - جب دوبارہ بیگم تسنیم آئیں تو بڑی بی بولیں کیوں بی بی تم ہی اکیلی آئی ہو - تمھاری بہن نہیں آئیں؟ ماشاء اللہ مزاج تو اچھا ہے" وہ بولیں "جی وہ آپ کا سامنا کرنے سے شرماتی ہیں" انھوں نے کہا کیوں - ارے انھوں نے میرا کیا بگاڑا ہے؟ میں تو سمجھتی ہوں کہ انھوں نے مجھ پر بڑا احسان کیا جو میرے بچہ کی آنکھیں کھولدیں - اب وہ زرا آسانی سے عشق و محبت کے پھندے میں نہیں پھنسے گا .... ان کو اب کی اپنے ساتھ ضرور لانا - اب انھیں کاہیکی شرم اور لاج - اب تو وہ خیال ہی دل سے جاتا رہا!"

غرضکہ بی بہار بھی آئیں - لیکن یہ عجیب بات تھی کہ ہندوستانی ساری اور معمولی پمپ پہنکر آئیں - نہ سینہ پر کھلا ہوا گاؤن زیب بدن تھا اور نہ میموں والا اونچی ایڑی کا بوٹ پاؤں میں تھا - اور جتنی دیر بیٹھی رہیں نیچی نظریں کئے متانت سے جواب دیتی رہیں اور جب گھر دیکھنے کے سلسلے میں اس کمرے میں پہونچیں جو خاص پروفیسر صاحب کے سونے اور پڑھنے کا کمرہ تھا - تو سب وہاں سے چلی آئیں لیکن یہ ٹھٹھک رہیں اور دیر تک سارے کمرے کو بغور دیکھتی رہیں - پھر سامنے میز پر جو قلمدان میں آلپین پڑی ہوئی تھی - اس کو اٹھالیا اور شلوکہ کا بٹن کھول کر دل کے اوپر اسے اس طرح چبھاتی گئی کہ "رعنا" کا لفظ وہاں پیدا ہوجائے اور جو خون ان زخموں سے نکلتا اس سے "بلوٹنگ پیڈ" میں جو سوختہ کے نیچے دفتی ہوتی ہے اس پر کچھ لکھا - پھر جلدی سے بٹن بند کرکے ادھر ادھر دیکھا خون آلودہ آلپین کاغذ میں لپیٹکر جیب میں رکھی اور وہاں سے چلی آئی -

(۹)

پروفیسر صاحب جو واپس آئے تو پیشانی پر گہرے نشانات ہونٹوں پر سختی اور دل و دماغ میں صحت کی قوت بھی ساتھ لائے - ماں نے جب مسکرا کر بلائیں لیں تو اسی کے ساتھ دو آنسو بھی بے اختیار آنکھوں سے گر پڑے -

پہلے ہی دن جب یونیورسٹی میں مس بہار کا سامنا ہوا اور انھوں نے سلام کیا تو جواب اسی لاپرواہی سے ملا جس سے کہ اور شاگردوں کو ملتا تھا اور جب وہ درس کے بعد کمرے میں کھڑی رہیں تو انھوں نے بے رخی سے انکی طرف دیکھکر پوچھا "کیوں؟ آپ کو کچھ پوچھنا ہے؟"

وہ اپنا ریشمی رومال دونوں ہاتھوں میں اینٹھتی رہی اور نظریں نیچی کئے بولی "صرف دریافت حال کرنا تھا کہ اب مزاج کیسا ہے؟"

یہ بولے "کیوں کیا میں بیمار معلوم ہوتا ہوں؟ میں تو برسوں سے علیل نہیں ہوا!"

وہ بولی "جی نہیں - صرف اس طرح دفعتاً مہینہ بھر کے لئے پہاڑ چلے جانے سے خیال ہوا کہ شاید دشمنوں کی طبیعت کچھ ناساز ہوگئی تھی؟"

انھوں نے کہا "نہیں - ایک کتاب فلسفہ الہیات پر لکھنا تھی اور اس کی داغ بیل ڈالنے کے لئے بڑی یکسوئی درکار

اطمینان قلب کی ضرورت تھی۔ سو وہ یہاں نصیب نہ تھی اسی لئے پہاڑ پر چلا گیا تھا!"

مس بہار نے اپنے سوکھے ہونٹوں کو زبان سے تر کیا اور بولیں تو کتاب شروع ہو گئی!"

اُنھوں نے کہا "جی ہاں بلکہ قریب ختم ہے۔ اب انشاء اللہ ہفتہ عشرہ میں طبع بھیجدونگا" اور یہ کہتے کہتے وہ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی الماری میں رجسٹر اور کاپیاں بند کر کے کمرے سے چلتے وقت بولے "اور اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد آپ چاہے چار پایہ بر کتابے چند" ہی کہیں لیکن دنیا تو مجھے فلسفی مان ہی لے گی!"

مس بہار خجالت سے عرق عرق ہو گئیں اور کچھ کہنے ہی کو تھیں کہ وہ کمرے سے چلے گئے اور یہ سر جھکائے اپنی سائیکل پر بیٹھیں اور گھر چلی آئیں۔ بہن نے اترا ہوا چہرہ دیکھکر پوچھا "کیوں خیر تو ہے کیسا مزاج ہے" یہ بولیں "کچھ نہیں سر میں درد ہے" اور پلنگ پر منہ لپیٹکر پڑ رہیں۔ گھنٹوں پڑی رویا کیں۔ تڑپا کیں۔ سوچا کیں۔ پھر اُٹھیں منہ دھویا اور بہن کے پاس آئیں اور اُن سے کہنے لگیں کہ "پروفیسر صاحب پہاڑ سے واپس آ گئے ہیں۔ انھیں کھانے پر کسی دن نہ بلائیگا؟" نسترن نے ان کی صورت دیکھی سر ہلایا اور خط کا کاغذ کھینچکر لکھا "جناب پروفیسر صاحب ہمارے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ پہاڑ سے واپس آ گئے چونکہ بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی اس لئے جی چاہتا ہے کہ آج شام کو کھانا ہمارے ساتھ کھا کر ہم لوگوں کو بھی رُخ انور کی زیارت کا موقع دیجئے۔ بیگم شمیم"

جب بیرہ خط لیکر پہونچا تو یہ ٹہل رہے تھے۔ خط لیکر پڑھا جواب لکھا کہ "بہت خوب۔ آٹھ بجے حاضر ہوں گا" اور گاڑیبان کو گاڑی پیچھے پیچھے لانے کا حکم دیکر ٹھیک پانچ بجے پیدل اپنی تفریح کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ خیال یہ تھا کہ گھومتے گھماتے آٹھ بجے تک وہاں پہونچ جائیں گے۔ اس لئے بڑے گھماؤ کا راستہ اختیار کیا کہ جسمیں پانچ چھ میل سے کم چلنا نہ پڑے۔ گاڑی اس لئے ساتھ لے لی تھی کہ اگر راہ میں تھک گئے تو بیٹھ لینگے۔

ادہر نسترن نے خط پڑھکر بہار کو دیا۔ سوکھے دہانوں پانی پڑا۔ کئی روز سے تفریح کے لئے نہیں گئی تھیں۔ ذرا سی اُمید نے غنچۂ ناشگفتہ کو کھلا دیا۔ اپنی ریشمی چھتری اُٹھا ٹہلنے نکل گئیں اور خیالات میں غرق نمعلوم کہاں سے کہاں پہونچگئیں اور یہ نہ سوچا کہ آج کل کا زمانہ اندھیرے اور ویرانے میں مردوں کے تنہا نکلنے کا تو ہی نہیں چہ جائیکہ کسی عورت کے۔ وہ بھی دوشیزہ اور پر جمال۔ مذہب کی آڑ پکڑنے والے بدمعاش ایسے موقعوں کے ہمیشہ متلاشی رہتے ہیں چنانچہ یہ اپنے خیالات میں غرق۔ رعنا کو منانے کی صورتوں پر غور کرتی چلی جا رہی تھیں کہ ———— دو آدمیوں نے انھیں دیکھا۔ آپس میں کچھ اشارے ہوئے اور وہ اُن کے پیچھے لگ لئے جب یہ آبادی سے بہت دور نکل گئیں اور آفتاب نے بھی اپنا رخِ روشن سیاہ چادر میں چھپا لیا تو وہ دونوں اُن کے برابر آ کر بولے "میم صاحب یہ بٹوہ اور چھتری ادہر لائیے" انھوں نے صید تو گرفتار کی طرح گھبرا کر ادہر اُدہر دیکھا۔ اپنے کو آبادی سے دور اُن کے بس میں پایا۔ انگریزی تعلیم نے جہاں خرابیاں پیدا کر دی تھیں وہاں اتنی بھلائی بھی کی تھی کہ ہمت پردہ میں بیٹھنے والیوں سے

کئی گونا زیادہ تھی۔ بلا تکان چھتری گھما کر دونوں کے منہ پر تڑاق تڑاق ماری۔ وہ جھجھلکر پیچھے ہٹے اور یہ بے تحاشا بھاگیں۔ چوٹ کھائے ہوئے حریف جھلا کر پیچھے دوڑے۔ عورت اور مرد کی دوڑ ہی پھر وہ بھی اس وقت جبکہ گاؤن زینت جسم ہو۔ اور ہدہد کی چونچ سی ایڑی والا جوتا پاؤں میں ہو تھوڑی دور تو نسیم سبک رو کی پھرتی دکھائی۔ پھر دم پھولنے لگا۔ گاؤن میں پیر الجھا۔ جوتے کی ایڑی کی وجہ سے قدم ڈگمگائے اور یہ منہ کے بل سڑک پر گر پڑیں۔ لب لعلیں کو لہو نے اور لال کر دیا۔ کہ اتنے میں دونوں بدمعاش ہو پہنچے اور ایک نے چھرا نکال کر بھرپور وار کیا۔ پہلو کو زخمی کرتا چھرا گاؤن میں در آیا۔ یہ چیخیں اور پھر اٹھکر بھاگیں۔ دوسرے نے لپککر ہاتھ تھاما۔ اور نازک کلائیاں اینٹھکر بولا "بس اب بٹوا لاؤ" اتنے میں پہلے نے پھر چھرا تانا۔ دوسرا بولا "بیوقوف ہوا ہے۔ یہ چیز جان سے مارنے کی ہے یا سینے سے لگانے کی؟" اور اس نے دوسرا ہاتھ بڑھا کر ان کی کمر میں ڈالا۔ یہ پھر چیخیں اور بیساختگی میں دل پر کندہ لفظ زبان پر آیا۔ اور "رعنا رعنا" کی آواز فضا میں گونج اٹھی! خدا کا کرنا کہ وہ بھی قریب ہی تھے۔ اپنا نام سنکر بے تحاشا دوڑے۔ گاڑیبان نے بھی گھوڑے کو چابک لگائی۔ قریب ہو کر دیکھا تو بہار کو ایک بدمعاش گود میں اٹھائے ہے۔ اور وہ تڑپ رہی ہے۔ یہ للکارتے آگے بڑھے۔ بدمعاشوں نے انکی آواز سنی اور گاڑی پیچھے آتے ہوئے دیکھی تو انھیں جلدی سے گود سے پھینک دونوں نے ایک طرف بھاگ نکلے۔ بس بہار گرتے ہی بیہوش ہو گئیں۔ انھوں نے جلدی سے انھیں گود میں اٹھا کر گاڑی میں ڈال دیا اور گاڑیبان سے اسپتال چلو کہکر ان کا سر زانو پر رکھکر خود بھی بیٹھ گئے۔

(۱۰)

پروفیسر رعنا نے مرہم پٹی بھی کرائی تو گود میں لئے ہوئے۔

جسوقت پہلو کا زخم باندھا جا رہا تھا تو دل کے قریب انھوں نے اپنا نام کھدا ہوا دیکھا۔ لاکھ ضبط کیا لیکن آنکھوں سے آنسو نکل ہی پڑے۔ وہ اسی طرح بیہوش پڑی تھیں کہ یہ نرسوں کی مدد سے اسپتال سے انھیں اپنے گھر جو قریب ہی تھا لے آئے۔ اور اپنے بستر پر لٹا کر ماں کو لخلخہ سونگھانے کی تاکید کر کے ڈاکٹر شمیم کو ٹیلیفون دینے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ بہار نے آنکھیں کھولیں سہمی ہوئی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر نحیف آواز سے پوچھا "میں کہاں ہوں؟" بڑی بی نے مسکرا کر جواب دیا "پردے کے حامیوں کے مکاں میں! میرے گھر میں!" اس کی غزالی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ "آہ" کر کے بولی "اماں میں نے اپنے کئے کی سزا پائی! نہ پردہ سے نکلتی نہ یہ گت بنتی!"

بڑی نے کہا "بیٹا سبق حاصل کرنے کے لئے اتنی تکلیف اٹھانا ضروری تھی خدا کرے اب بھی آنکھ ہو جائے!"

اتنے میں رعنا آگئے۔ اس نے انھیں دیکھا اور آنکھیں چرالیں بڑی بی چپکے سے کمرے سے کھسک گئیں۔ رعنا ان کے پاس آئے اور آہستہ سے بولے "مزاج کیسا ہے؟" بہار نے آنکھیں کھولیں ادھر ادھر دیکھا۔ رعنا پھر مسکرا کر بولے "وہ چلی گئیں!"

وہ بھی مسکرا دی اور چپکے سے بولی "پہلو میں درد ہے۔ لیکن دل مسرت سے لبریز!"

"کیوں"

وہ بولی "اس لئے کہ آپ نے جان و آبرو بچائی - اب . . اب تو . . شاید اس کی ملکیت سے انکار نہو گا؟"

یہ بالکل نہ سمجھے اور گھبرا کر استعجاب سے بولے "کیا؟ کہا؟"

اس نے کہا "جس دل پر آپ کا نام کندہ ہے وہ حاضر ہے!"

اللہ رے فلسفیت - بولے "یہ نام کس نے کندہ کیا؟"

وہ بولی "انھیں ہاتھوں نے!" پوچھا "کیسے؟" اُسنے بلاٹنگ پیڈ کی طرف اشارہ کر کے کہا "اسے اٹھائیے" یہ متعجب ہوکر اٹھالائے اس نے سوختہ ہٹاکر انھیں دکھا دیا "لکھا تھا "میں نے ہاری مان لی!" اور گاؤن میں ہاتھ ڈال کر ایک پرزے میں لپٹی ہوئی زنگ آلود آلپین نکالی اور کہا "دونوں جگہ اسی سے لکھا گیا - اور روشنائی خونِ دل کی تھی -

یہ ایک مرتبہ کانپے - پھر بیساختہ جھککر ان ہاتھوں کا آلپین سمیت پیار کر لیا - اور اُس نے ان کی جھکی ہوئی گردن میں اپنی باہیں حمایل کر دیں اور بولی "میں ہندوستانی بنکر پردہ میں رہوں گی مجھے اب سوائے آپ کے دنیا میں کچھ اور نہ چاہئے للہ - اب تو "پیشانی کی ان شکنوں کو مٹا ڈالئے!"

اُنھوں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر پوچھا "تو مولوی بلاؤں"

وہ کچھ شرمائی پھر بولی "اسی حالت میں؟"

پروفیسر نے کہا "ہاں!"

اس نے اپنے ہونیوالے شوہر کے ان مضبوط ہاتھوں کو جنھوں نے زبردستی اس سے اُسکا دل چھین لیا تھا کھینچکر اپنی آنکھوں سے لگالیا اور مسکرا کر بولی "جیسی مالک کی خوشی!"

علی عباس حسینی - ام - اے

(**نگار**) یہ فسانہ جناب علی عباس حسینی ام اے کا ہے، جو ہیں لکھنؤ میں ایک استاذ کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آجکل میرے اوقات بعض علائق قلب و روح کی وجہ سے ایسی گمشدگی کی حالت میں بسر ہو رہے ہیں کہ مضامین کو بغور مطالعہ کرنے کی اجازت نہیں ملتی اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب کاپیاں میرے پاس آتی ہیں تو بعض اوقات ان میں اس قدر حذف و اضافہ کرنا پڑتا ہے کہ صحت ناممکن ہو جاتی ہے اور بار دگر اُن کی کتابت کی ضرورت پڑتی ہے۔

جسوقت یہ فسانہ مجھے ملا تو میں نے اس کو بھی بغیر دیکھے ہوئے کاتب کے حوالہ کر دیا، لیکن جب کاپیاں سامنے آئیں اور مجھے لفظاً لفظاً اُسے پڑھنا پڑا تو معلوم ہوا کہ اشاعت سے قبل مجھے صاحب مضمون سے گفتگو کر لینا ضروری تھا تاکہ کم از کم وہ غلطیاں جو فن افسانہ نگاری کے لحاظ سے اس میں نظر آتی ہیں دور ہو جاتیں۔

جناب علی عباس حسینی جیسا کہ اُن کے اس فسانہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے بہت ذہین آدمی ہیں، لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ وہ ہنوز اپنے افسانہ کے ہیرو پروفیسر رعنا کی طرح بالکل نوجوان ہیں اور شاید انھیں مشکل سے یقین آئے گا اگر میں یہ کہوں کہ وہ اس افسانہ کے ذریعہ سے اپنے جس مقصد کو پیش کرنا چاہتے تھے اس میں اُنھیں مطلقاً کامیابی نہیں ہوئی - فاضل فسانہ نگار نے یہ ثابت کرنا چاہا تھا کہ مردوں عورتوں کا ایک ہی اسکول یا کالج میں تعلیم پانا مضر نتایج پیدا کرنے والا ہے اور اسی سلسلہ میں چونکہ قدرتاً پردہ کی بحث کا آجانا ضروری تھا - اس لئے ضمناً یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ "پردہ عافیت ہے اور بےپردگی مصیبت کا گھر" - فسانہ میں جو واقعات اس نتیجہ پر پہونچانے کے لئے درج کئے گئے ہیں وہ صرف یہ ہیں کہ :-
(۱) پروفیسر رعنا چونکہ دوسرے طلبہ کے ساتھ مس بہار کو بھی پڑھاتے ہیں اس لئے باہم محبت ہو جاتی ہے اور اُس کے بعد شادی - (۲) مس بہار

چونکہ بے پردہ پھرنے کی عادی ہیں اس لئے ایک شام کو انھیں دو بدمعاش گھیر لیتے ہیں۔ لیکن اتفاق سے پروفیسر رعنا آجاتے ہیں اور انھیں بچاکر پہلے اسپتال اور پھر گھر لیجاتے ہیں۔

اگر لڑکیوں کا لڑکوں کے ساتھ تعلیم پانا صرف اسی حد تک مضر ہوسکتا ہے کہ ایک پروفیسر کسی لڑکی سے یا کوئی لڑکی کسی پروفیسر سے شادی کرلے تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس طریق تعلیم کے محاسن کے اظہار میں اور کیا زبردست دلیل پیش کی جاسکتی ہے۔ ضرورت تھی کہ مس بہار کے اخلاقی انحطاط کو مکمل طور پر دکھایا جاتا اور پھر ایک عام فسانہ نگار کی طرح علی عباس صاحب حسینی کو اختیار تھا کہ اسکی حالت میں ردعمل (Reaction) دکھاکر اصلاح پر لے آتے یا ایک بلند تخئیل رکھنے والے ادیب کی طرح اُس کو ایسی حالتمیں رکھکر صرف چند نقوش عبرت چھوڑ جانے پر اکتفا کرتے۔ بے پردگی کی مذمت کے ثبوت میں جو واقعہ انھوں نے پیش کیا ہے وہ ایسا حقیر، ضعیف اور کمتر درجہ کا ہے جو صرف بازاری ناولوں کے لئے موزوں ہوسکتا ہے۔ بدمعاشوں کا کسی خاتون کو گھیر کر زخمی کردینا، یا اس کی چیزیں اچک لے جانا بلکہ اس سے بھی زیادہ دیگر مکروہ مناظر پیدا کرنا، ایسی باتیں نہیں ہیں جو بے پردگی ہی کی حالت میں رونما ہوتی ہوں۔ ہزاروں اسی قسم کے واقعات پردہ نشین خواتین پر بھی گزر چکے ہیں اور گزرتے رہینگے افراد فسانہ کا جو کیرکٹر پیش کیا گیا ہے وہ حد درجہ نامکمل و ناقص ہے۔ اور خصوصیات سیرت کے لحاظ سے جو گفتگو اُن کی درج کی گئی ہے وہ یکسر عامیانہ ہے

پروفیسر رعنا کو پورا فلسفی اور خشک منطقی بتایا جاتا ہے لیکن اولین ملاقات میں مس بہار سے جس بیباکی و عریانی کے ساتھ گفتگو کرتا ہے وہ صرف غیر فلسفیانہ بلکہ ایک حد تک غیر شریفانہ بھی ہے۔ کم از کم پروفیسر رعنا کی گفتگو کو جو پردہ کا حامی تھا افسانہ کے تارو پود (پلاٹ) کے لحاظ سے حد درجہ مہذب ہونا چاہئے تھا۔ مگر فسانہ نگار نے یہی نہیں کیا کہ اُن کی گفتگو کو ان کی سیرت کے خلاف پیش کیا بلکہ مس بہار کے مکان پر پہونچا کر انھیں پیانو کے ساتھ آزادانہ نچا گوا بھی دیا۔ پروفیسر رعنا نے جو تقریر پردہ کی حمایت میں کی ہے وہ اس قدر سطحی، اس درجہ پامال اور کمزور خیالات پر مبنی ہے کہ ایک فلسفہ کے پروفیسر کیا معنے معمولی پڑھے لکھے آدمی سے بھی اس کی توقع نہیں ہوسکتی۔

یہ تو وہ بڑی بڑی نقائص ہیں جو سارے فسانہ پر یکساں طور سے حاوی ہیں۔ رہے چھوٹے چھوٹے نقائص ہیں جو زیادہ تر ابس کی گفتگو میں نظر آتے ہیں ان کے اظہار کی ضرورت نہیں، ذوق سلیم اُن کے بے محل ہونے کو آسانی سے سمجھ سکتی ہے۔ مس بہار زخمی ہوکر پروفیسر رعنا کے مکان پر غشی کی حالت میں پہونچتی ہے اور جب آنکھ کھولکر وہ تعجب سے سوال کرتی ہے کہ میں کہاں ہوں تو پروفیسر رعنا کی ماں جواب دیتی ہیں کہ "پردہ کے حامیوں کے گھر میں"۔ یہ وقت ہرگز طعن و تشنیع کا نہیں ہوسکتا تھا۔ اس جواب سے علی عباس صاحب نے پروفیسر رعنا کی ماں کی سیرت کو کافی مکروہ کردیا ہے۔ الغرض یہ فسانہ پلاٹ کے لحاظ سے ناقص، سیرت نگاری کے لحاظ سے متباین الاقوال، افراد کی گفتگو کی حیثیت سے یکسر عامیانہ۔ اور زبان کے لحاظ سے بہت ژولیدہ ہے

تخئیل اور انداز بیان البتہ کہیں کہیں ضرور پُرلطف ہے۔ امید ہے کہ جناب عباس حسین صاحب میری اس تنقید کو تنقیص نہ سمجھیں گے بلکہ دوستانہ مشورہ سمجھکر آئندہ ان باتوں کا لحاظ رکھنے کی کوشش کریں گے

نیاز

نقد الشعر

سلسلہ کے لئے
(ملاحظہ ہو نگار ماہ دسمبر سنہ ۱۹۲۷ عیسوی)

مناقضہ و تناقض

تمام کلام میں یہ ہے کہ دوسرے معنے، اول معنے کے منافی استعمال کئے جائیں جیسا کہ ایک شاعر کہتا ہے:-

درمش بخشم بوسہ ندہد جور کند
بدرم جامہ کہ بوسہ نفروشد بدرم

اس شعر کے دونوں مصرعوں میں تناقض کی یہ صورت ہے کہ پہلے میں شاعر بخششِ درم کا ذکر کرتا ہے۔ دوسرے میں بیع و شرا کا معاملہ پیش کرتا ہے۔

بعض ناقدانِ فن کے نزدیک تاویل بعید کے اعتبار سے یہ شعر اس سقم سے پاک ہے ان کے نزدیک یہ معنے ہوں گے کہ اگر درم بخشتا ہوں تو بوسہ نہیں دیتا، اگر چاہتا ہوں کہ خرید لوں تو بعوض درم بیچتا نہیں۔ ہمارے خیال میں یہ مطلب شعر کے ظاہری الفاظ سے بغیر تاویل کے پیدا نہیں ہوتا اس لئے اس کا دامن "سقم" سے پاک نہیں ہو سکتا۔ ایک شاعر کہتا ہے:-

ہجرانِ تو با مرگ برابر کنم زیراک
از مرگ بتر باشد ہجرانِ تو دانی

پہلے مصرع میں ہجراں کو شاعر نے مرگ کے برابر کہا ہے دوسرے میں مرگ سے بتر کہتا ہے۔

انوری کہتا ہے:-

اے ملکِ تراعرصۂ عالم سرِ کوئے
وز ملکِ تو تا ملک سلیماں سرِ موئے

پہلے مصرع میں ممدوح کے ملک کو انوری نے وسعتِ عالم سے زیادہ قرار دیا ہے۔ دوسرے میں ملکِ سلیماں سے کم۔ یہ درست نہیں ہوتا۔ بعض کے نزدیک اس کا نام نزول فی المدح ہے، اس صورت میں اس کے معنے میں تناقض نہیں بلکہ انوری کا منشا یہ ہے کہ ممدوح کے ملک سے سلیماں کا ملک کم ہے۔ باوجود اس کے کہ سلیماں کے ملک کی وسعت وحوش وطیور کو بھی شامل ہے اس کا نام اغراق اور مبالغہ ہے۔

بہرحال یہ شعر شائبہ و شک تناقض سے خالی نہیں باوجودیکہ اُس کی تاویل بھی کی گئی، ہمارے خیال میں جو شعر تاویل اور تعبیر کا محتاج ہو وہ معیوب ہے۔

تضمین

تضمین کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم تو یہ ہے کہ شعر اول معنے کے اعتبار سے بالکل دوسرے شعر سے متعلق ہو، اس شعر کا نام مضمن ہے۔

"ضمان" شریعت میں خاص قسم کے مال اور دَین کو کہتے ہیں۔ یہ صورت بھی عیب کی مشہور ہے۔ استادانِ فن کے نزدیک، ہر شعر کو بجائے خود مستقل ہونا چاہئے اور باعتبار ترتیب معانی، دونوں کلام ایک دوسرے سے تعلق نہ رکھیں۔ جن اشعار میں اس قسم کی خصوصیت جس قدر زیادہ ہوگی اسی قدر معیوب سمجھے جائیں گے یہ صورت اشعار عرب میں زیادہ ہے۔ مثلاً:-

لما ابلث للاظعان ولّت ام لرس
م مغفرا وحش منهم ودرس

اس شعر میں پہلا مصرع "لرسم" تھا لیکن اس کو ٹکڑے کرکے پہلے میں صرف "لرس" رہنے دیا اس کا قافیہ دوسرے مصرع میں "درس" رکھا اور "م" کو اس کے متعلق کردیا۔

یہ صنعت یعنی صنعت قبیح ہے، عربی میں بھی استادان فن بنظر استحسان نہیں دیکھتے لیکن جا بجا استعمال کرتے ہیں، فارسی میں اس کا استعمال ہزلیات اور ظرافت کے علاوہ مذموم ہے

ایک شاعر نے اسی صنعت مضمن میں اسی اعتبار سے ذیل کے اشعار کہے ہیں:-

شادماں باد مجلسِ مستو	فی شرق حمید دیں آجو
ہری آں صدر رکز جواہر آل	فاظِ او اہل دہر ودانش دو
مت تفاخر کنند وجاے تفا	خر بود زانکہ زاں جواہر طو
تی مرصع شو و بگیرد ان آب	نائے ارباب فرد زینت دروَ
نق آں طوق ہر کہ یافت براص	حاب دیوان و دیں بود مستو
جی باقبال وجاہ مجلس مے	مونِ روز انک کلک دست صنو
بر مستان نظم و نثر و معا	ملتِ ملک و دیں وازہر تو
ع کہ جوئی دُرد ست جلہ دُبا	زبانست مثلِ ر دستو
فی زہے خط و خامۂ تو سل	سل و مشکیں چو زلف جعت تو

شاد و نو شاد شد بخط تو دی
وآنِ شاہ نو زینت شادی نو

توقیف معنوی، اس قدر ناقص نہیں کہ اس کا شمار عیب میں ہو بلکہ اس نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے کہ اس کا استعمال بالکل نادر اور شاذ ہے۔ مثال کے طور پر "مسعود سعد" کے اشعار دیکھیئے:-

جواد کفی عادل دلی کہ در قسمت — ز ظلم و بخل نیاید نصیب او الا کہ

کہ جام بادہ بہ ساقی دہد ز دست تہی — بہ تیغ سر بزند کلک را اگر دہ خطا

معزی کہتا ہے:-

آواز تو خوشتر ہمہ روئی — نزدیک من اے لعبت فرخار

ز آواز بنماز بامداد دیں — در گوش غمین مرد بیمار

ان دونوں مثالوں میں معنوی اعتبار سے ہر پہلا شعر دوسرے شعر میں اس قدر ملحق ہے کہ بغیر اُن کے مفہوم و مقصد شاعر سمجھ میں نہیں آتا بعض متکلفین شعرا نے اس کا نام استدراک رکھ کر جائز کرنا چاہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اصولاً دونوں صورتیں قبیح ہیں

تضمین کی دوسری قسم یہ ہے کہ کوئی شاعر کسی دوسرے شاعر کا کوئی مصرع یا شعر لیکر اس میں اپنا شعر ضم کرے، لیکن شرط یہ ہے کہ عذوبت اور شیرینی میں فرق نہ آنے پائے۔ بلکہ دونوں ٹکڑے ایک معلوم ہوں۔

رشید نے عنصری کے مصرع کو لیکر اپنے مصرع میں اس طرح ضم کیا ہے کہ پتا لگانا اور ایک کو دوسرے سے جدا کرنا دشوار ہے:-

چنین نماید شمشیر خسروان آثار — نمود تیغ تو آثار فتح و گفت فلک

دوسری احتیاط یہ بھی ہے کہ "شاعر" اس کا اظہار بھی کردے کہ "میں تضمین کر رہا ہوں یہ مصرع یا شعر فلاں شاعر کا ہے۔

انوری کہتا ہے:-

دریں مقابلہ یک بیت ارزقی بشنو — نہ از طریق تنحل بوجہ استدلال

ز مرد و گیہ سبز ہم دو ہم رنگ اند — ولیک تیز بنگیں و ان کشد و زان بجوال

عدول

اس کی چند صورتیں ہوتی ہیں۔

صحت وزن یا درستی قافیہ کے لئے "شاعر" اپنے شعر میں "لحن" کا لحاظ کر کے خطائے لفظی و معنوی کو جائز رکھے پھر بھی عیب میں شمار ہوگا۔ اگرچہ اس کے جواز کے دعوئے کے لئے "یجوز للشاعر" کی دلیل بھی لائی جائے لیکن بقول قیس رازی اس عیب کے لئے زبان عربی کا ہنر درکار ہے، کیونکہ شعرائے عرب کلام منظوم کے واضع اور موجد ہیں، زبان عربی میں وسعت بھی بہت ہے، اس میں قیاسات لغوی کی نوعیتیں بھی بکثرت ہیں، صرف و نحو کا تصرف بھی نسبتاً اس زبان میں زیادہ ہے۔ اس لئے اگر شعرائے عرب اس قسم کے خط و خال حسن شاعری میں پیدا کر سکیں تو اباحت کی حدیں ہوں گے۔ فارسی اور اس کے مقلد اردو کے شعرا کا یہ منہ نہیں ہوسکتا۔ "سیبویہ" کی رائے اس "بدعت" کے متعلق یہ ہے کہ "شعرائے عرب جو کچھ تغیرات اور ترمیمات جائز رکھتے ہیں ان کے

مواقع سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ ان کے پاس ہر دعوے کی دلیل ہوتی ہے۔ اس کے خلاف اُن کے مقلدین ہیں جن کے بساط دلیل میں تقلید کے سوا اور کچھ نہیں رہتا۔

ہمارے ایک دوست اکثر موقع پر کہا کرتے ہیں کہ فلاں شاعر فارسی نے یہ لکھا ہے لہذا اُن کو اردو میں بھی لکھنا چاہئے، ایسی ناقص دلیل ہے کہ دعوے کو اپنے حال پر قائم نہیں رکھ سکتی۔

قیس رازی نے اس موقع پر حسب ذیل نہایت معقول صلاح دی ہے:۔

"شاعر مفلق" و صاحب سخن حاذق کے لئے یہ ضروری ہے کہ اپنی نظم کو نثر سے بالکل مختلف نہ کردے، فارسی اور تازی کلمات جو حکایات سلیس اور خطب و رسائل میں مذکور ہیں اپنی نظم میں استعمال کرے۔ ارباب فضل و اہل طبع کی پیروی کرے، ایسا نہ کرے جیسا کہ آج کل اردو کے شعرا فارسی پر یا خود زبان اردو پر ظلم کر رہے ہیں، تراکیب عجیب، الفاظ غریبہ، محاورات ثقیلہ آج کل سند قابلیت ہے۔ اگر یہی لیل و نہار رہے تو زبان اردو کا جنازہ اُٹھ جائے گا۔

زیادات

یہ بھی مہلک ستم ہے، اس کی مثال "بہرامی" کے شعروں میں دیکھئے:۔

چگوئی کز ہمہ خرّاں جنو بودست کس نیزا
نہ ہست اکنوں و نہ باشد و نہ بودست ہرگیزا
نگاہ خشم او، گوہر شود ہم رنگ شونیزا
جنو خوشنود باشد من کنم ز انفاس قرمیزا

ان اشعار میں تشبیہات بارد، استعارات رکیک، تراکیب نامہذب کے علاوہ دو عیب ایسے ہیں کہ ان کے بیان سے چشم پوشی کرنا "علم شعر" پر ناقابل معافی ستم ہوگا:۔

اوّل۔ لفظ "ہرگز" میں "ی" کا اضافہ یعنی اسکو "ہرگیز" کہنا۔ اسی طرح "قرز" کو "قرمیز" استعمال کرنا ہے۔

دوم۔ الف اشباع کا اضافہ۔

یہ دو غلطیاں اور غلطیوں کے ساتھ لفظی ہیں، معنوی استقام ان پر مستزاد ہیں۔ بہرامی صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

ممدوح کو جب غصہ آتا ہے تو گوہر صاف و شفاف سیاہ اور بے نور ہو جاتا ہے اور جب خوش نظر آتا ہے تو میں اپنے سیاہ چہرے سُرخ کر لیتا ہوں، بہرامی صاحب نے ممدوح کی خاطر سے اپنے کو سیاہ رو کہہ ڈالا

ہروز مشرقی کہتا ہے:۔

معرے بکشاد و بر روے زنان ناخونا   نوحہ گر کردہ زبان جنگ حزیں از غم گل

"ناخن کو کھینچ کر "ناخون" بنا دیا۔

رودکی کہتا ہے :- بود نے بود مے بیا اکنوں

رطل بر کن مگوے بیش سخون

سخن کی بات بڑھا کر "سخون" کر دیا۔

ارزقی کہتا ہے :- در مدح ناکساں نکنم کہنہ بر بنیز زاں باک نادیم کہ بود کہنہ پیرہن

"نیز" پر "بہ" بڑھا کر بنیز کر دیا۔

خاقانی صاحب فرماتے ہیں :-

زاں عقل بد دگفت کہ اے عمرؔ عثماں

ہم عمرؔ خیامی وہم عمرؔ خطاب

سنائی نے ایک جگہ لکھا ہے :- بود مر شرع را بدر عمرّ۔

لفظ عُمر کو مُشدد کر دیا۔ بدترین عیوب شعر ہے۔ علی ہذالقیاس رودکی نے فارسی الفاظ کو اس طرح مشدد کیا ہے

خزّ بجاے علم و خرگاہ بدلِ باغ و بوستاں آمد

مور بجاے سوسن آمد باز مےّ بجاے ارغواں آمد

خزّ، بجاے، مےّ، کو مشدد کر دیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی زیادات لفظی ایسے ہیں جو ابتداے غلط مستعمل ہیں۔ مقلدین آنکھیں بند کر کے تقلید کرتے ہیں اور اس تقلید کو دلیل صحت سمجھتے ہیں :-

ناگاہیاں، ناگاہ کے معنے ہیں۔ فرداد، فردا کے معنے ہیں، اسی طرح الفاظ دیباہ برناہ۔ دوتاہ۔ آسیاب۔ دریاب ہیں۔

خاقانی کہتا ہے :-

ہست بہ پیرامنش طوف کناں آسماں آرے بر گرد قطب چرخ زند آسیاب

"آسیاب" اصل میں آس آب تھا۔ اس میں "ی" زیادہ کی گئی۔ کثرتِ استعمال سے "ب" ساقط ہو گئی اس لئے یہ لفظ "آسیا" ہو گیا۔ پس آسیاے باد۔ یا دست آسیا کہنا غلط ہو گا۔ اسی اصول پر خراس کہتے ہیں "خر آسیا نہیں کہتے۔ "دریا" بھی اصل میں در آب تھا یعنے دریدۂ آب "کثرت استعمال سے دریا ہو گیا۔ بعض متقدمین نے "دریاب" استعمال کیا ہے۔ وہ زیادات میں داخل ہے۔ حذوف، بھی عیب میں داخل ہے۔ مثلاً مُشدد حروف مخفف کر دے جائیں۔ جیسا کہ سنائی نے کہا ہے :-

مصطفےٰ راز حال کرد آگاہ　　یلمزدن المطوعین ناگاہ

مطوعین کی "ط" مشدد ہے لیکن ضرورت شعری کی وجہ سے تخفیف جائز رکھی، "اسقاط حروف" بھی مذموم ہے منصور منطقی کہتا ہے:-

باز گرم دل زتو چنانکہ بدادم　　صبر کنم صبر ہرچہ بادا بادم

"گرم" "گیرم" کی جگہ ضرورت شعر کی وجہ سے مذموم و معیوب ہے۔

سنائی کہتا ہے:-

آدمی چوں بداشت دست زعیت　　ہرچہ خواہی بکن کہ فاصنع شیت

"فاصنع شیت" مخفف ہے۔ اذا لم تستحی فاصنع ما شئت کا، جو بالکل نادرست اور ناجائز ہے۔ اسی طرح الفاظ خمش مخفف خاموش، فرموش مخفف فراموش، جہن مخفف جہاں نہن بجائے نہاں شند بجائے شنید معیوب ہیں۔ علیٰ ہٰذالقیاس اس تغیر الفاظ کو بھی اسی زمرے میں سمجھنا چاہیے صراطِ مستقیم سے بھٹکائے گئے ہوں مثلاً معروفی کہتا ہے:-

بار خدا العبدلی را چہ بود　　کز بس پیران سر دیوانہ شد

عبدلی۔ ابو عبد اللہ کی خرابی ہے۔

ابو شکور کہتا ہے:-

آب انگور و آب نیلوفل　　مرمرا از عبیر و مشک بدل

قافیہ کی رعایت سے نیلوفر بگاڑ کر نیلوفل بنایا گیا ہے۔ اسی طرح الفاظ ہنیز بمعنی۔ ہنوز۔ غنویدن بمعنی غنودن، شنویدن بمعنی شنودن، خفتیدن و چنیدن بمعنی خفتن، رسائدن و رہاندن بمعنے رسانیدن و رہانیدن وغیرہ مذموم اور مقدوح ہیں۔

خطاہائے معنوی

لفظی غلطیوں کی طرح معنوی غلطیاں بھی عام طور پر ساری و جاری ہیں ان کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

رافعی کہتا ہے:-　　معطی نشود مردم ممسک بہ تعاطی　　احور نہ شود دیدۂ ازرق بہ تکحل

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ:- بخیل بزور سخی نہیں ہو سکتا۔ "تعاطی" یعنی عطا باب تفاعل میں اس معنی میں مستعمل نہیں۔ تعاطی کے معنے جراٗت اور اقدام کے ہیں۔ اس ارتکاب کا سبب "معطی" کے ساتھ مجانست کا خیال ہوا۔ دوسرا شعر کہتا ہے:-

اے اختر سخا کہ زسیر نوال خویش　　ہر روز در سپہر تفاخر کنی قِران

اس شعر میں نجوم کے ساتھ تفاخر کنی قران کہا جاتا تو درست ہوتا کیونکہ ستارے کا قران ستارے کے ساتھ ہوتا ہے۔ بغیر تعین "مقارن" نہیں کہا جا سکتا۔

باقی ۔۔۔ باقی　　کیفی چریا کوٹی

ایک عجیب وغریب خواب

گزشتہ شب کو میں ایک بیحد پیچیدہ مگر بہت دلچسپ مقدمہ اعادۂ حقوق زناشوئی کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اسی ادھیڑبن میں رات کے دو بج گئے۔ میں نے کتابیں بند کیں۔ لمپ کی بتی کم کی اور پلنگ پر سونیکی نیک نیت سے لیٹ گیا۔ ایک عرصہ تک مقدمے کے خیالات کی منتشر فوج نے نیند کو قریب آنے نہ دیا۔ مگر میں بھی نہایت مستقل مزاجی سے آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ پھر میں کب سوگیا مجھے خبر نہیں۔ .... آنکھ لگی ہی تھی کہ ایک عجیب وغریب خواب کا سلسلہ شروع ہوا جو رات بھر ختم نہ ہوا۔ خواب تو میں نے بہت دیکھے ہیں اچھے۔ برے۔ دلچسپ۔ ڈراونے۔ غرض سب ہی قسم کے اور خاص کر ان راتوں میں جب دسترخوان پر بیٹھکر پکہ میں ضرورت سے زیادہ جھاڑو دیدی ہے مگر ایسا عجیب وغریب خواب میں نے بیسویں صدی میں تو کبھی نہیں دیکھا اور اس کے پہلے کا مجھے ہوش نہیں۔ ———— ایک بہت بڑا لق ودق میدان ہے اور اس میدان میں ہزاروں، لاکھوں کی تعداد میں مردوں اور عورتوں کا ہجوم ہے۔ پہلے تو مجھے یہ دہشتناک خیال پیدا ہوا کہ کہیں یہ میدان حشر تو نہیں ہے۔ مگر جب آفتاب کو آنکھ اٹھاکر دیکھا اور وہ بجائے سوا نیزے کے کئی کروڑ میل دور دکھائی دیا تو یہ وہم جاتا رہا۔ ہر طرف ایک عجیب شور وہنگامہ تھا۔ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے بڑے بڑے گرہوں میں لوگ منتشر تھے اور ہر گروہ میں عورتوں اور مردوں کے حقوق وفرائض پر پرجوش مباحثے ہورہے تھے۔ زنانہ اخبار اور رسالے خوب بک رہے تھے کہیں کسی بلند مقام سے کوئی عورت چیخ چیخ کر اور ہاتھ پھینک پھینک کر مردوں کے خلاف اشتعال انگیز تقریر کررہی تھی۔ کہیں کوئی مرد کھڑا عورتوں پر جابجا اعتراضات کی آگ برسا رہا تھا۔ الغرض ہر طرف زندگی اور نہایت متحرک زندگی کے آثار نمایاں تھے میں سخت پریشان تھا کہ یا اللہ یہ کیسا مجمع ہے جس میں اتنی کثیر تعداد میں عورتیں اور بالخصوص کمسن اور شریف لڑکیاں انتہائی لاپروائی اور بیباکی سے منہ کھولے مردوں کے سامنے ادہر ادہر پھر رہی ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ بعض بعض ان میں مردوں سے مباحثہ کیا ہنگامۂ خلاف قانون برپا کئے ہوئے ہیں۔ میں یہ تعجب خیز سین عالم محویت میں دیکھ رہا تھا کہ میری نظر ایک حسین کمسن لڑکی پر پڑی جو ملبوس سے پنجاب کے طرف کی معلوم ہوتی تھی۔ وہ اپنے ہاتھ میں ایک ڈنڈا اور دوسرے میں ایک کپڑے کا گڈا (مرد کا مجسمہ) لئے ہوئی تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد نہایت جوش وغضب کے ساتھ اس گڈے کو گالیاں دے دیکر اسی ڈنڈے سے پیٹنے میں مصروف ہوجاتی تھی۔ اور پیٹتے ہوئے ہانپ ہانپ کر ایک پرخروش تقریر بھی کرتی جاتی تھی۔ جس کے چند جملے مجھے یاد رہ گئے ہیں مثلاً ظلم! ظلم! ظلم۔ سب اسی کی ذات سے ہے (گڈا مارا گیا) میرے کو اس کا یقین ہے۔ نہیں۔ میرا اسیر ایمان ہے۔ کہ یہی ہے ہماری آزادی کا چور۔ یہی ہمارے حقوق کا رہزن ہے۔ جہاں یہ اور اس کی قوم ملے اسے مارو۔ چنانچہ خود قرآن پاک میں آیا ہے فاقتلوہم حیث ثقفتموہم۔ (گڈا پھر بہت مارا گیا) پیاری بہنو کیا باریتعالی کے اس ارشاد کے بعد بھی تمھیں اسیر اور اس کی قوم پر جہاد کرنے میں کوئی تامل ہے۔ (یک زنانی آواز۔ ہرگز نہیں۔) اور بہنو! اگر تم اس کو اور اس کی قوم کو اپنی جسمانی کمزوری یا اپنے نازک حنائی ہاتھوں کے دکھ جانے کے خوف سے نہ مار سکو تو کوسو! خوب پانی پی پی کر کوسو! ہاتھ اٹھا اٹھاکر کوسو! دانت کچکچا کچکچا کر کوسو کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اس ظالم قوم کو مارنا گو تمام عبادتوں میں افضل ترین عبادت ہے۔ مگر کسی وجہ سے اگر اسے مار نہ سکو تو اسے کوسنے میں بھی ستر ہزار نیکیوں کا ثواب ملتا ہے۔ بس میری پیاری بہنو! آؤ ثواب کی طرف آؤ ثواب کی طرف (موذنوں کی طرح دونوں کانوں میں انگلیاں دیکر) حی الی الفلاح۔ حی الی الفلاح۔ .... اور پیاری بہنو! عقلمند بہنو! مظلوم بہنو! حدیث شریف میں یہ بھی آیا ہے کہ اگر مسوڑھے پھول جائیں یا دانت میں درد ہو یا ہلانے کی وجہ سے تم ظالموں کی اس قوم کو نہ کوس سکو تو انھیں جس طرح سے ہوسکے فرضی قصے لکھ لکھ کر خوب بدنام کرو کیونکہ مستند راویوں سے روایت ہے کہ بدنام کرنے میں بھی چالیس ہزار نیکیوں کا ثواب ملتا ہے۔ .... مظلوم بہنو! میں نے اسی جہاد اکبر کے لئے اپنی ساری زندگی وقف کردی ہے۔ چنانچہ خود حافظ شیرازی بوستاں میں فرماگئے ہیں:۔

باش در پے آزار و ہر چہ خواہی کن　　　　کہ در شریعتِ ما غیر ازین گناہے نیست

(گڈا پھر ڈنڈے سے مارا گیا) خوب بدنام کر اس کو اور اس کی قوم کو کیونکہ پچھلی مردم شماری میں مردوں کی آبادی میں ۹۹ فیصدی خلیفۃ الشیاطین نکلے تھے۔ (گڈے کو ایک دھپ مار کر اس کے کان پھر شدید بیدردی سے اُمیٹھے گئے) پیاری بہنو! ابھی میں نے اور بہت کچھ کہنا ہے مگر وقت تھوڑا ہے اور (گڈے کے پھر کان اینٹھ کر) ظالموں کی قوم کے اس نمائندہ کو پیٹنا بہت ہے۔ لہذا اپنی مختصر تقریر ختم کرتی ہوں۔" عورتوں کے گروہ نے خوب تالیاں بجائیں اور زندہ باش۔ زندہ باش کے پرجوش نعرے بلند کئے ...... عورتوں کے اس گروہ میں خال خال کچھ مرد بھی دکھائی دیتے تھے۔ جو قیافے سے کسی نہ کسی اخبار کے اڈیٹر یا مخصوص نامہ نگار معلوم ہوتے تھے اور جو اس تقریر کو سُن سُن کر حد درجہ محظوظ ہو رہے تھے اور کبھی اپنی ناک کو۔۔۔ کھجا کھجا کر تبسم فرماتے اور کبھی آگے بڑھکر اس لڑکی کی جھٹ جھٹ بلائیں لینے لگتے تھے ...... میں انکی ذہنیت پر فاتحہ پڑھتا ہوا ایک بظاہر خوش مزاج لڑکی کی طرف بڑھا اور اس سے ڈرتے ڈرتے پوچھا "کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ یہ خاتون کون ہیں۔ اور انکی پرورش کس آب و ہوا میں ہوئی ہے" اس لڑکی نے مجھے ایک حقارت آمیز نظر سے۔ سر سے پیر تک دیکھا اور کہا "اور آپ کی پرورش کس ابلولستان میں ہوئی ہے جو آپ فلک نامہ نگاری کے اس ماہتاب شب چار دہم سے واقف نہیں ...... مردوں کی جہالت کی کوئی حد و انتہا ہی نہیں۔ اور پھر بھی یہ اپنے تئیں کامل العقل اور ہم کو ناقص العقل کہتے ہیں"۔

میں:۔ "اے گلستان خوش مزاجی کی بہار جانفزا! آپ میری جہالت پر ناحق برافروختہ ہیں کیا کروں پردے کی بیہودہ رسم کی وجہ سے میں ہندوستان کی ہر ایک حسین اور کمسن لڑکی کو صورت سے نہیں پہچانتا۔ اب یہی دیکھئے نا کہ مجھے اور در اصل سارے ہندوستان کو اصولاً آپ کو بھی جاننا چاہئے مگر اسے اپنی شومئی قسمت کہوں یا خوبئ قسمت ہیں آپ کو بھی نہیں پہچانتا ––––––

لڑکی:۔ (دانت پیسکر) او گستاخ مرد۔ خدا تیری جنس کو اگر کل غارت کرنیوالا ہو تو آج ہی غارت کر دے۔ بجز ہم لوگوں کی دل آزاری کے تم انسان نما درندوں کا دنیا میں کوئی اور کام نہیں۔ اختر جہاں سچ کہتی ہیں کہ جو گت اس گڈے کی انھوں نے بنائی ہے وہی ہم سب کو تمھاری اور تمھاری ساری قوم کی بنانی چاہئے ......" اور اس کے بعد نیستان نسائیت کی اس بپھری ہوئی شیرنی نے جو جو گل افشانیاں میرے اور میری جنس کے متعلق کی ہیں وہ غالب بھی پیمانۂ صہبا سامنے رکھکر نہیں کر سکتے تھے۔ میں ایک مظلوم مرد کی طرح سر جھکائے سنتا رہا اور کبھی جب ان تنفرازی کے ابنار سے پھولوں کی بارش شدید ہو جاتی تھی تو میں دو ایک باتیں مسکرا کر اپنی بریت میں کہہ دیتا تھا۔ مگر ان بے گنہ الفاظ سے بھی جلتے ہوئے پھولوں کی بارش کی شدت میں یک بیک جوگنی ترقی ہو جاتی تھی۔ اتفاق سے ایک جوشیلے اور تنک مزاج مولوی صاحب جو کچھ عرصے سے میرے پاس ہی کھڑے ہوئے یہ گلابو شتابو کا تماشا دیکھ رہے تھے دفعتاً پٹرول کے پیپے کی طرح بھڑک اُٹھے اور فلک نامہ نگاری کے ماہتاب شب چار دہم اور گلستان خوش مزاجی کی بہار جانفزا (یعنی گلابو اور شتابو) سے مخاطب ہو کر یوں آتش فشاں ہوئے:۔

"بس بس! خاموش او بدزبان لڑکیو خاموش! میں بہت سن چکا۔ اب زیادہ سننے کی مجھے تاب نہیں ...... خدا کی پناہ! ہماری ہی پسلی سے تم پیدا ہوئیں اور ہمارے ہی سینہ پر تم کودوں دلو! ہماری ہی بلی اور ہمیں سے میاؤں۔ او دیدہ دلیر لڑکیو! اگر دنیا میں کسی جنس کی ضرورت نہیں ہے تو قسم ہے اس ریش مبارک کی (اپنی مختصر مگر عزیز داڑھی پر ہاتھ پھیر کر) تمھاری جنس کی ضرورت نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ تمہاری جنس ہے ہی کس مصرف کی۔ سوائے بچہ پیدا کرنے کے دنیا کا کوئی ایسا کام نہیں جو ہم تم سے بہتر اور ہزار اور لاکھ درجہ بہتر نہیں کر سکتے۔ تم لوگ بھولی کس بات پر ہو؟ اور رہا تمھارا اکلوتا وصف۔ بچے پیدا کرنا۔ تو اس پر بہت نہ اتراؤ۔ کیونکہ ہمارا خدا تمھارے اس توسط کا بھی محتاج نہیں۔ جس طرح ہمارے جد امجد آدم کو بغیر ماں باپ کے پیدا کیا ساری بنی نوع انسان کو بھی خدا یونہی پیدا کر سکتا ہے۔ او گستاخ لڑکیو احسان مانو ہمارے دادا جان آدم کا اور دعا دو ان کو کہ محض اُن کی سفارش پر اور صرف انکی خدمت اور دلجوئی کے لئے تمھاری

نانی جان پیدا کی گئیں اور وہ بھی ہمارے دادا جان ہی کی بائیں پسلی سے ورنہ آج جتنی ساریاں پہنے مانگ نکالے۔ انکھڑیوں میں سرمہ دانی جھونکے ہوئے تم لوگ ادہر ادہر بغاوت کرتی پھرتی ہو کہیں ایک بھی نہ دکھائی دیتیں۔ عنقا کی طرح لاپتہ ہوتیں اور یاد رکھو کہ اگر تم نے اپنے طور طریقے نہیں بدلے اور اس شور و فساد بلوے اور بغاوت سے باز نہ آئیں تو اب بھی ہم سب کی متفقہ عرضداشت پر تمہاری جنس کی پیدائش یکقلم مفقود ہو سکتی ہے۔ غضب خدا کا جس جنس سے دنیا کے تمام اولوالعزم انبیا اور جلیل القدر پیغمبر پیدا ہوے ہوں اسی جنس کو تم کوسو کاٹو اور برا بھلا کہو......

ڈرو! ڈرو! لڑکیو! خدا کے قہر سے ڈرو! نہیں تو چشم زدن میں دیکھتے ہی دیکھتے تم سب صفحۂ ہستی سے گدھے کی سینگوں کی طرح غائب ہو جاوگی اور یہ بھی نہ معلوم ہوگا کہ تم کب آئی تھیں اور کہاں چلی گئیں"۔ ادہر مولوی صاحب جل جلالہ اسی سلسلے میں کچھ اور آتش فشانی کرنے کا محکم ارادہ رکھتے تھے۔ ادہر عورتوں کی ایک زبردست فوج جیٹھ بیساکھ کی آندہی کی طرح ہمارے اردگرد جمع ہوتی جاتی تھی۔ یورپ کی جنگ عظیم سے ابھی ابھی دنیا نے نجات پائی تھی اور چونکہ دوسری جنگ عظیم کے المناک نتایج برداشت کرنے کی ہمارا تھکا ہوا خستہ حال سیارہ تاب نہیں لا سکتا تھا لہذا میں نے فوراً مولوی صاحب ممدوح کا ہاتھ پکڑ لیا اور انہیں ایک طرف کو کھینچکر مجمع سے علیحدہ کرنے لگا۔ مگر وہ اپنی جگہ سے کسی طرح ٹلتے نہ تھے۔ بہزار دشواری انہیں کھینچکر الگ لے گیا اور ٹھنڈا پانی پلایا مگر مولوی صاحب اسوقت چھوٹے موٹے کوہ آتش فشاں ہو رہے تھے بڑی بڑی مشکلوں سے ٹھنڈے ہوے۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ مولوی صاحب آپ تو خواہ مخواہ بگڑ جاتے ہیں۔ آپ لونڈوں کے کہنے کا کیوں برا مانتے ہیں۔ یہ جو کچھ بھی کہیں انہیں کہنے دیجئے کہیں اس سے ہم لوگوں کی عزت جاتی ہے"۔

مولوی صاحب:۔۔۔ (سیاہ سانپ کی طرح پھنکار مار کر) فونہہ۔ جی بجا فرماتے ہیں۔ آپ لوگ یہ برداشت کریں مگر بندے سے یہ نسائی ہذیان برداشت نہیں ہو سکتا........... فو۔و۔ نہہ........"

میں:۔۔ (مولوی صاحب کی داڑھی میں ہاتھ ڈال کر) اچھا۔ اچھا جو ہوا سو ہوا۔ مولوی صاحب! آپ کو والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس کی آیت کی قسم بس اب آپ خاموش ہو جائیے۔ لڑکیاں ہی تو ہیں۔ ابھی نئی نئی جوانی ہے۔ کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔ ابھی یہ کیا جانیں کہ ہمارے حقوق اور ان کے فرائض کیا ہیں۔ جب بال سفید ہوں گے اور سر کسی بڑے دن کے بوے کی طرح ہلنے لگیگا اسوقت ان کو ہوش آئیگا ابھی الکا لڑکپن ہے اور لڑکپن یا آغاز جوانی کی آزادیاں اور بیباکیاں کون نہیں جانتا.......... اور گستاخی معاف ہو تو عرض کروں۔ مجھے تو انکی شوخیاں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں"۔

مولوی صاحب:۔۔۔ ہاں صاحب آپ کو بھلی معلوم ہوتی ہونگی۔ ہمیں تو ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔

میں نے مولوی صاحب کو اس مجمع سے ڈیڑھ دو فرلانگ الگ لیجاکر چھوڑ دیا تاکہ پھر واپس نہ آسکیں۔ اور اس کے بعد آگے بڑھا۔ وہاں سے چلتے چلتے ایک مقام پر پہونچا۔ وہاں ایک عجیب شور و غل سنا۔ ادہر ادہر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ سامنے سے ایک بہت بڑا مجمع چلا آ رہا ہے۔ اس میں مرد بھی ہیں عورتیں بھی اور ہر سن و سال کی۔ میں ایک طرف کو ہٹ گیا۔ مجمع سامنے سے گزرنے لگا۔ جب سب قریب آئے تو میں نے دیکھا کہ کسی کا جنازہ ہے۔ اور اسے نہایت جوش و خروش سے نوجوان مرد اور نوجوان عورتیں کاندھا دے رہی ہیں۔ مگر بجائے غم آلود ہونے کے ان کے چہرے کسی قلبی مسرت سے چمک رہے ہیں میں سخت حیران تھا کہ یہ کس کا جنازہ ہے جس کی موت پر لوگ خوشیاں منا رہے ہیں اور گاتے بجاتے جا رہے ہیں خیال ہوا شاید کسی امیر ہندو گھرانے کی بڑی بوڑہی کا جنازہ ہو۔ اس مجمع کے آخر میں کچھ مقدس سفید ریش بزرگ کچھ سنجیدہ اور متین انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب کچھ بوڑہی مستورات دکھائی دیں۔ ان سب کی صورتیں غمگین اور پریشان تھیں۔ ان کے الجھے ہوے گرد آلود بال ان کی پیشانیوں پر پڑے ہوے تھے۔ اور ان میں سے کچھ لوگ تو آہستہ آہستہ آنسو بہا رہے تھے۔ اور کچھ ڈھاریں مار مار کر رو رہے تھے۔ مجھے ان سب کو دیکھ کر ایک قلبی صدمہ ہوا۔ اور میں سوچنے لگا "یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے کہ اس جنازہ کے ساتھ کچھ لوگ گا بجا رہے ہیں اور کچھ لوگ آہ و زاری کر رہے ہیں"۔

مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے بڑھ کر ایک انگریزی تعلیم یافتہ شریف صورت صاحب کو سلام کیا اور اُن سے پوچھا "کیوں صاحب یہ کس کا جنازہ ہے اور آپ کس کی موت کا ماتم کر رہے ہیں"؟

میرے ہمدردانہ سوال سے ان صاحب کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اور ایک گریہ آلود آواز میں انہوں نے جواب دیا۔ صاحبزادے کیا پوچھتے ہو کہ یہ کس کا جنازہ ہے ...... آہ! یہ مرحوم پردے خاں رضی اللہ عنہ کا جنازہ ہے۔ ہائے کیا کروں مجھے ابھی تک انکی موت کا یقین نہیں آتا۔ مرحوم ایک عرصہ سے بیمار تھے اور حال میں ان کی علالت خطرناک ترقی کر گئی تھی۔ مگر یہ کسے معلوم تھا کہ وہ دنیا سے یوں سدھار جائیں گے ہم لوگوں نے کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی۔ کوئی دوا ایسی نہیں تھی جو نہ دی ہو کوئی علاج ایسا نہ تھا جو نہ کیا ہو! مگر۔ آہ۔

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا　　دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

ایسے جو گرے تو مرحوم پھر نہ سنبھلے!۔ انکی تیمارداری میں ہم سب لوگ دن کو دن رات کو رات نہ سمجھے مگر.... حالت نہ سنبھلنا تھی نہ سنبھلی!......

(آنسو پونچھکر) رات کو بیچارے، جنت کو سدھارے......... وہ تو چھوٹ گئے .... مگر ہم سب کو زندہ درگور کر گئے.... ہو! ہو! ہو! ہو!" بیچارے زیادہ ضبط نہ کر سکے زار و قطار رونے لگے۔ اُسپر ایک ضعیفہ بولیں۔

"ہائے میں تو پہلے ہی سے کہتی تھی کہ ان موئے انگریزوں کا علاج نہ کرو۔ مریض پر انکا سایہ بھی نہ پڑنے پائے اور کچھ بھی ہو انگریزی دوائیں نہ استعمال ہوں مگر اس وقت کسی نے میری نہ سنی۔ سب انہیں موئے انگریزوں کا جامہ پہنے ہوئے تھے......... آخر کار انکی جان ہی لیکر صبر آیا اور اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے......... وہ بیچارے اپنی جان سے گئے۔ تمہیں کیا؟ ۔ ارے کچھ دنوں رو پیٹ کر خاموش ہو جاؤگے۔ اور کیا کروگے!۔ سچ ہے تقدیر کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔"

دوسری ضعیفہ:— نہیں بوا! انگریزوں کی دوا سے جو نقصان ہوا سو ہوا۔ یہ سب لڑکے اور لڑکیاں جو اس کا اسوقت خوش خوش جنازہ اُٹھائے لیے جاتی ہیں ان کو ان سے ہمیشہ کا للّٰہی بغض تھا......... ان کی حالت بُری ضرور تھی مگر ایسی بھی نہ تھی۔ ہو نہ ہو۔ ان سب نے ڈاکٹروں سے ملکر اُن کو زہر دلوا دیا ورنہ انکی بیماری کوئی ایسی مہلک نہ تھی۔ کھانسی بخار کی شکایت ہی تو تھی.... یہ تو موسم کی تبدیلی سے اکثر ہو ہی جایا کرتی ہے اور آب و ہوا کی تبدیلی سے جاتی رہتی ہے۔!! تم کچھ بھی کہو۔ مجھے یقین ہے کہ مرحوم کو زہر دیا گیا اور ضرور دیا گیا"!

میں:— (تعجب سے) مگر آخر ان لوگوں کو مرحوم سے ایسی جلن اور دشمنی کیوں تھی؟

وہی تعلیم یافتہ بزرگ:— میاں جلن اور دشمنی کیوں نہ ہوتی۔ ان ہی کی وجہ سے تو ان کا سارا کام رکا ہوا تھا۔ ٹینس بیڈمنٹن۔ ہاکی فٹ بال کھیلنے وہ نہیں جا سکتی تھیں! سینما۔ تھیٹر۔ میلوں ٹھیلوں میں وہ شریک نہیں ہو سکتی تھیں۔ لیلیٰ مجنوں۔ شیریں فرہاد۔ یوسف زلیخا بننے میں ان کو رکاوٹیں ہوتی تھیں۔ غرضکہ ان کی غیر محدود آزادی میں پردے خاں مرحوم کی ذات سے سخت خلل پڑتا تھا۔ بیباکی سے ایک دوسرے سے دل نہیں مل سکتی تھیں۔ دلی امنگیں انکی پوری نہیں ہونے پاتی تھیں۔ کھل کھیلنے کا انہیں موقع نہیں ملتا تھا۔ اسی سبب سے تو ان بیچارے کو زہر دیا۔ اور کس لیے؟ وہ تو کہو اب تک ہم بڑے بوڑھوں کی روک تھام تھی— ہمارا پاس و لحاظ تھا۔ آنکھوں کا پانی نہیں مرا تھا۔ دلوں سے خدا رسول کا خوف نہیں رخصت ہوا تھا ورنہ یہ سب کب ہی انکا کام تمام کر چکے ہوتے......... اور اب کیا ہے......... اب وہ ان کے جنازے پر شادیانے بجائیں انکی قبر پر ناچیں کودیں۔ رنگ رلیاں منائیں جو کچھ نہ کریں وہ تھوڑا ہے۔ مگر صاحبزادے میری بات یاد رکھنا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ یہی لوگ انکی موت پر ہم لوگوں سے زیادہ پھوٹ پھوٹ کر روئیں گے"!

میں:— وہ کب اور کیوں؟

وہی حضرت:— ارے بھئی اس وقت تو ان سب کو جوانی کا جوش ہے۔ آج کل انکی زندگی کی بہار ہے۔ گلابی فضا میں ہر چیز گلابی اور نظر فریب

معلوم ہوتی ہے .... آزادی کو وہ سمجھتے نہیں مگر آزادی کے بت کو پوجنے کے لئے اوندھے گرے پڑتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ اگر آزادی کی ہوش ربا شراب کو آنکھ بند کرکے غٹ غٹ پی لینے سے پہلے اُسے وہ عقل سلیم کی خوردبین سے دیکھ لیں تو انھیں اس جھلکتی ہوئی شراب کے ہر قطرے میں سیکڑوں اور ہزاروں مکروہ اور زہریلے کیڑے نظر آئیں اور بجائے منہ میں لگانے کے وہ اس جام بلورین کو نفرت سے زمین پر پٹک کر چور چور کر ڈالیں۔ دہوکا دینے اور دہوکا کھانے کے لئے بھلے وہ جو چاہیں رنگ آمیزیاں کریں مگر غور سے دیکھیں تو جس آزادی کے وہ مدعی ہیں اس کا دوسرا نام اخلاقی برہنگی ہے .... مگر ابھی یہ سب تھوڑا ہی کسی کو دکھائی دیگا .... ہاں جب بڑھاپا آئیگا۔ بال سفید ہوں گے خون ٹھنڈا پڑجائیگا۔ اور اُن کے بیٹے اور بچیاں جوان ہو کر اسی آزادی کے دعویدار ہوں گے جس پر اب یہ جان دیتے ہیں۔ سو وقت اس شراب کے خمار کی کیفیت معلوم ہوگی۔ اس وقت یہ اپنے کئے پر پچھتائیں گے۔ اور سر پچھاڑ کر رودیں گے .... اور ابھی کیا ہے؟..... ابھی تو راوی چین لکھتا ہے"

ان تعلیم یافتہ بزرگ کی یہ بات میرے دل میں تیر کی طرح لگی کیونکہ آزادی کے صحیح مفہوم کی بابت میں اسی وقت کھٹکا تھا جب میں نے ایک مرتبہ چند اعلیٰ تعلیمیافتہ نوجوانوں کو آپس میں یہ باتیں کرتے سنا تھا کہ آزادی بڑی اچھی چیز ہے۔ یہ تو ہم بھی مانتے ہیں مگر سچ پوچھو تو بھئی اپنے گھر کی عورتوں کو ہم باہر نکالیں گے چاہے کچھ بھی ہو جائے اور ہاں یوں تو ہماری دلی آرزو مدتوں سے یہی ہے کہ اور سب عورتیں باہر نکلیں۔ اور آزادی سے سب سے ملے ملائیں۔ رہی صحت کی خرابی۔ تندرستی کا اہتمام۔ اور دنیا بھر کی بقیہ فلسفیانہ دلیلیں اور دیدہ زیب منطق یہ تو سب خوبصورت خوبصورت بہانے ہیں۔ جن کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہماری ہی زندگی میں دوسروں کی عورتیں پردے سے باہر نکل پڑیں۔ پھر کیا ہے۔

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است وہمین است وہمین است

کا نقشہ ہوگا۔ ہماری ہی زندگی اور خاصکر جوانی میں پردہ اٹھ جائے! ہمکو اسی سے مطلب ہے۔ پھر اس کے بعد کیا ہو کیا نہ ہو۔ ہمکو پروا نہیں جو لوگ ہمارے بعد آئیں گے وہ جانیں انکا کام جانے۔ خوب کھاؤ خوب پیو خوب لطف اڑاؤ کیونکہ بہت ممکن ہے کہ تم کل ہی مرجاؤ یہی بہترین اصول ہے اور یہی ہر ایک کی زندگی کا اصول ہونا چاہئے بقول ظفر۔

صبح تو جام سے گزرتی ہے
شب دلآرام سے گزرتی ہے

عاقبت کی خبر خدا جانے
اب تو آرام سے گزرتی ہے

اِن سب باتوں کے سننے کے بعد میرے دل میں یہ خطرہ گزرا کہ اسی قسم کا پاکیزہ فلسفہ کہیں ان لوگوں کا بھی نہ ہو جو تقریر اور تحریر میں تو پردہ اٹھا دینے کے نہایت جوشیلے محرک ہوتے ہیں اور جب کوئی اُن سے یہ ٹیڑھا سوال کر بیٹھتا ہے کہ حضرت آپ خود کیوں اپنے گھر کی مستورات کو باہر نہیں نکالتے تو وہ لاجواب ہو کر اپنا کلھیا ایسا منہ کھول دیتے ہیں یا کھنکھارتے ہیں اور کھنکھار کر خاموش ہو جاتے ہیں ....!

انہیں تمام خیالی گتھیوں کو سلجھاتا ہوا میں آگے بڑھا۔ بہت دور نہیں گیا تھا کہ مجھے سامنے سے کچھ نوجوان مرد اور کچھ نوجوان عورتیں آتی ہوئی دکھائی دیں۔ عورتوں کی وضع قطع تراش خراش قابل دید تھی۔ کاندھوں تک تو ان کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے تھے۔ کہنیوں کے ذرا اوپر ایک ہلکا سا سوتی کا کرتہ پہنے ہوئے تھیں گلے اور سینہ کے نصف سے زیادہ حصہ کی نہایت آزادانہ نمائش ہو رہی تھی۔ بال اُن کے پیچھے سے کٹے ہوئے تھے۔ واجد علی شاہ مرحوم کے درباریوں کی طرح نشر پٹے رکھے ہوئے تھیں۔ انکی بھنویں اور پلکیں سیاہ اور ہونٹ اور رخسار سُرخ رنگے ہوئے تھے۔ ان کے دانت بہت خوبصورت مگر سب مصنوعی تھے۔ اور اُن کی خوبصورتی دکھانے کی دردناک خواہش کیوجہ سے وہ بار بار اپنے منہ کو اس کان سے اس کان تک چیرنے کی کوشش کرتی تہیں یعنی مسکراتی تھیں۔ ساریاں انکی نفیس اور بیحد مہین ریشم کی تہیں۔ ایسا مہین ریشم کہ آفتاب کی راز افشا کرنیں بلا تکلف اور بلا روک ٹوک ادہر سے اُدہر اور ادہر سے ادہر آجا سکتی تھیں۔ قدرتی حسن کی دلفریبی میں انسانی دستکاری

اپنی ہلکی نظر فریب نقاب سے اور چار چاند لگا رہی تھی۔ الغرض وہ عورتیں کیا تھیں اچھی خاصی رنگی ہوئی متحرک نیم برہنہ تصویریں تھیں! وہ بے حجاب پریاں اپنے دیو زاد ساتھیوں کی بغل میں ہاتھ ڈالے ہنسی مذاق کرتی۔ لجاتی۔ اٹھلاتی۔ بل کھاتی۔ مسکراتی چلی آرہی تھیں۔ میں دہقانیوں کی طرح منہ کھولے ٹکٹکی لگائے حیرت کا پتلا بنا دیکھتا رہا۔ وہ آئیں بھی اور گزر بھی گئیں اور مجھے معلوم ہی نہ ہوا کہ کب آئیں کب گزر گئیں .... جب ذرا مجھے ہوش آیا تو میں نے ایک شخص سے پوچھا کہ یہ کس ملک کی عورتیں تھیں تو اس نے جواب دیا "تم جانتے نہیں۔ یہ ۱۹۵۵ء کے ہندوستانی شریف گھرانوں کی تعلیم یافتہ خواتین ہیں" میرا دل و دماغ حیرت و استعجاب۔ غیرت و شرم کے صدمے سے ہل گیا اور میں خواب ہی میں دعا مانگنے لگا کہ یا اللہ یہ اصلیت نہ ہو خواب ہو۔ اگر ہماری قوم کی تہذیب کا معیار اور ترقی اور تعلیم کا نقطۂ عروج یہی ہے تو یا اللہ ۱۹۵۵ء کے قبل ہی یہ ملک بحر ہند یا خلیج بنگال کی موجوں کے نیچے آجائے تو اچھا" قریب ہی ایک چشمہ تھا۔ وہاں میں نے پانی پیا۔ منہ دھویا۔ اور اپنے منتشر حواس خمسہ کو مجتمع کر کے پھر آگے بڑھا۔ بہت دور نہیں گیا تھا کہ میں نے ایک بلند اور عالیشان عمارت دیکھی۔ اس کے اندر آنے جانے والوں کا ایک تانتا بندھا ہوا تھا۔ مرد بھی تھے عورتیں بھی اور سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں۔ میں بھی وہاں پہونچا اور گھستا ہوا کہنیاں مارتا ہوا۔ لوگوں کے پیروں کو کچلتا ہوا ایک عظیم الشان کمرے کے اندر داخل ہوا۔ کمرہ کم از کم ساٹھ فٹ اونچا تھا اور اس کی چوڑائی ساڑھے تین سو فٹ اور لمبائی پانچ سو فٹ سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ اس میں بھی خلقت کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ مع مبالغہ تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ کمرے کے ایک سرے پر تقریباً ۱۵ فٹ اونچا ایک چبوترہ تھا جس کے اردگرد لوہے کا خوبصورت کٹہرا لگا ہوا تھا۔ چبوترے کے بیچ میں ایک عالیشان کرسی اور میز رکھی ہوئی تھی۔ ادہر ادہر عمال دست بستہ کھڑے تھے۔ کرسی خالی تھی۔ لوگ اس کرسی کی طرف بنچوں پر کھڑے ہو ہو کر اور سارس کی طرح گردنیں نکال نکال کر دیکھ رہے تھے۔ ایکبارگی چبوترے کے ایک طرف کا دروازہ کھلا اور ایک نہایت لحیم وشحیم۔ قدر آور۔ بارعب۔ قوی ہیکل بزرگ آفتاب کی کرنوں سے بنی ہوئی عبا پہنے اور دستار باندھے ہوئے کمرے میں حاکمانہ انداز سے داخل ہوئے۔ انکی داڑھی بہت لمبی سفید اور نورانی تھی۔ آنکھیں بہت بڑی۔ خوبصورت چمکدار اور پُر جلال تھیں۔ جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئے اللہ اکبر کا ایک پر جوش نعرہ بلند ہوا۔ وہ بزرگ آکر چبوترے کی عالیشان کرسی پر متمکن ہوئے۔

میں نے آہستہ سے پوچھا کہ یہ بزرگ کون ہیں تو ایک شخص نے کہا۔ یہ امیر القضاۃ ہیں۔ جتنے دعوے اللہ میاں کے اجلاس پر کرنا ہوتے ہیں وہ پہلے ان ہی کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ اور پھر یا تو انھیں خود کرتے ہیں یا اگر وہ بہت اہم اور پیچیدہ ہوئے تو انہیں کسی فرشتہ کے ہاتھ اللہ میاں کے فیصلے کے لئے بھیج دیتے ہیں"

اتنے میں امیر القضاۃ نے اپنی گرجتی ہوئی آواز میں کہا "خاموش! - اب مقدمات کی کارروائی شروع ہوتی ہے! پکارو۔ مسماۃ حوا خانم بنام آدم خاں۔ کوئی حاضر ہے؟"

نقیبوں نے باواز بلند پکارنا شروع کیا۔ کمرے میں ایک ہلچل پڑ گئی۔ تھوڑی دیر میں ایک کمسن حسین عورت پارسی ساڑی اور بیحد اونچی اڑی کا لیڈیز شوز پہنے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی چال دیکھکر لوگ حیران تھے کہ یا اللہ یہ عورت ہے یا کوئی نئے قسم کی بطخ! اور اس کے پیچھے پیچھے ایک نوجوان بیرسٹر صاحب ہاتھ میں مثل لئے نظر پڑے۔ دوسرے دروازے سے ایک قد آور خوشرو جوان مع ایک سنجیدہ سن رسیدہ وکیل کے کمرے میں داخل ہوا۔ ان لوگوں کو دیکھتے ہی بھیڑ دریائے نیل کی طرح پھٹ گئی اور چبوترے تک ایک لمبا سا راستہ بن گیا۔ چبوترے کے داہنی طرف جا کر وہ عورت اور بیرسٹر صاحب کھڑے ہوئے اور بائیں طرف وہ خوشرو جوان اور اس کے سن رسیدہ وکیل صاحب۔

بیرسٹر صاحب :- (عدالت سے) حضور۔ مسماۃ حوا خانم مدعیہ حاضر ہے

وکیل صاحب :- اور آدم خان مدعا علیہ بھی حضور حاضر ہے

امیر القضاۃ:- "ہوں!...... تو کیا اس مقدمے میں صلح کی اُمید نہیں ہے-؟

بیرسٹر صاحب:- (چالاکی سے) حضور ہم تو ہر طرح سے راضی ہیں مگر مدعاعلیہ اس قدر ضدی اور بدمزاج شخص ہے کہ کسی عنوان سے کسی شرط پر راضی ہی نہیں ہوتا۔ حضور میری موکلہ پر سخت ظلم ہو رہا ہے۔ اور بالکل عاجز ہو کر اُس نے عدالت میں چارہ جوئی کی ہے۔

وکیل صاحب:- اس قسم کی مہمل اور بے سروپا پیش بندیوں سے آپ عدالت کو مدعاعلیہ سے بدظن نہیں کر سکتے۔ دراصل یہ مدعاعلیہ ہی کا کلیجہ ہے کہ وہ مدعیہ کی غیر ذمہ دار بے عنوانیاں بلاچون وچرا خاموشی سے اب تک برداشت کرتا چلا آرہا ہے۔ اور اب بھی مدعیہ اگر مدعاعلیہ کے ساتھ رہنے پر راضی ہو تو مدعاعلیہ اس کی ہر قسم کی خاطر اور دلجوئی کے لئے دل وجان سے طیار ہے۔

بیرسٹر صاحب:- حضرت۔ ساتھ رہنے کا سوال تو اٹھائے ہی نہیں۔

وکیل صاحب:- اسی پر میرے لائق دوست کو دعویٰ ہے کہ انکی موکلہ ہر طرح سے راضی ہے۔ معلوم ہو گیا کہ مدعیہ کی طرف سے صلح کی کوشش نہیں بلکہ سب زبانی داخلہ اور قانونی مکاری ہے۔

بیرسٹر صاحب:- (خفا ہو کر) میں ان نا ملائم اور غیر مہذب الفاظ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوں۔

وکیل صاحب:- واقعات کا اظہار اور مکر وفریب کی پردہ دری عین تقاضائے قانون وتہذیب ہے۔

امیر القضاۃ:- بس! بس! یہ لفظی جنگ ختم کیجئے۔ میں آخری مرتبہ دریافت کرتا ہوں کہ صلح کی کوئی صورت ہے یا نہیں؟

مدعیہ:- (مگرمچھ کی طرح آنسو بہا کر) دہائی ہے حضور کی۔ میں (مدعاعلیہ کی طرف اشارہ کرکے) اس شخص کے ظلم سے نیم جان ہو رہی ہوں۔ میری زندگی تلخ میرا جینا حرام ہو گیا ہے۔

امیر القضاۃ:- کیا ہوا نیکبخت کیا ہوا؟ مدعاعلیہ تجھ پر کیا ظلم کرتا ہے؟

مدعیہ:- حضور میرے تمام خداداد حقوق سے انکار کرتا ہے اور میری خداداد آزادی کو مجھ سے زبردستی چھین لینے کی کوشش کرتا ہے۔

مدعاعلیہ:- حضور! یہ سب اس کے تریا چرتر ہیں۔ اس کا رونا بناوٹی۔ اُس کے آنسو مصنوعی۔ اس کی شکایتیں سب جھوٹی ہیں۔ حضور اسکے سر پر ولائتی جن سوار ہے اور کچھ نہیں۔

امیر القضاۃ:- اچھا اب خاموش۔ صلح کی فی الحال کوئی امید نہیں معلوم ہوتی (پیشکار سے) پیشکار مقدمہ کی کارروائی شروع کرو۔

پیشکار:- بہت اچھا خداوند۔ جیسا حکم ہو!

امیر القضاۃ:- مدعیہ کا عرضی دعویٰ پڑھو۔

پیشکار نے عرضی دعویٰ باآواز بلند پڑھنا شروع کیا۔ عرضی دعویٰ اس قدر دلچسپ تھا کہ میں نے جلد جلد اس کا مضمون یاد کر لیا۔ جہاں تک میرا حافظہ کام دیتا ہے عرضی دعویٰ کا مضمون کچھ اس قسم کا تھا۔

بعدالت جناب اللہ میاں صاحب جل شانہٗ وجل جلالہٗ

مسماۃ حوا خانم زوجۂ آدم خان عمر تخمیناً ۱۹ سال ساکن شہر لاہور صوبہ پنجاب

بنام

آدم خان ولد لامعلوم پیشہ ڈپٹی کلکٹر عمر تخمیناً ۲۵ سال ساکن شہر لاہور صوبہ پنجاب

دعویٰ ستقرار حق وصدور احکام امتناعی

مدعیہ حسب ذیل عرض پرداز ہے :۔

دفعہ (۱) یہ کہ مدعیہ کا نکاح ہمراہ مدعاعلیہ بموجب شرع محمدی و رواج قوم و برادری فریقین بتاریخ یکم جنوری سنہ ۱۹۵۸ء ہوا اور اس وقت سے مدعیہ ہمراہ مدعاعلیہ حقوق زناشوئی ادا کرتی رہی۔

دفعہ (۲) یہ کہ نکاح مذکور کے بعد تخمیناً ۶ ماہ تک مدعاعلیہ نے بہترین برتاؤ رکھا۔ اس کے بعد مدعاعلیہ کے ربط ضبط میں رفتہ رفتہ فرق ہوتا گیا یہاں تک کہ ایک سال کے بعد کوئی ایسا دن یا رات نہیں گزری کہ مدعاعلیہ نے مدعیہ سے بہت چھوٹی چھوٹی اور مہمل باتوں پر حجت اور تکرار نہ کی ہو

دفعہ (۳) یہ کہ فریقین کی باہمی رنجش بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہونچی کہ مدعاعلیہ، مدعیہ کی صورت سے بیزار ہو گیا۔ (حالانکہ مدعیہ کے حسن و جمال کی تعریف زبانی و تحریری اکثر تعلیم یافتہ مردوں نے بارہا تخلیہ میں و نیز پبلک کے سامنے کی ہے جسکا ثبوت مدعیہ بعد میں پیش کریگی)

دفعہ (۴) یہ کہ اب ایک عرصے سے مدعاعلیہ نے مدعیہ سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ اور باوجود طلب و تقاضانہ مدعاعلیہ مدعیہ کا مہر دیتا ہے اور نہ اس کا ماہواری گزارا ادا کرتا ہے۔ مدعیہ کو مدعاعلیہ کے اس ظالمانہ برتاؤ سے بیحد رنج اور تکلیف ہے اور اس کی سخت حق تلفی ہو رہی ہے۔

دفعہ (۵) یہ کہ علاوہ مظالم متذکرۂ دفعۂ ماسبق کے مدعاعلیہ مدعیہ کے چند ناقابل انکار خدا داد حقوق سے (جن کی تشریح دفعہ دادرسی میں ہے) از راہ دل آزاری و نقصان رسانی مدعیہ انکار کرتا ہے۔ اور چونکہ مدعاعلیہ کے اس طرز عمل سے مدعیہ کے حقوق پر آئندہ زوال آنیکا قوی احتمال ہے لہذا ضرورت نالش ہوئی۔

دفعہ (۶) یہ کہ بنا مخاصمت دعوی ہذا بتاریخ یکم جنوری سنہ ۶ء بروز نکاح فریقین و بعد اس کے جب مدعاعلیہ نے مدعیہ کے حقوق سے انکار کیا یا انکار کرنے کی صورت بنائی یا اس کی نیت کی مدعیہ کو بمقابلہ مدعاعلیہ پیدا ہوئی۔

دفعہ (۷) یہ کہ مالیت دعوی ہذا بغرض سماعت عدالت ہذا مبلغ ایک لاکھ روپیہ ہے مگر چونکہ دعوی استقراریہ ہے لہذا صرف مبلغ دس روپیہ کورٹ فیس ادا کی گئی۔

دفعہ (۸) یہ کہ مدعیہ مستدعی دادرسی ہائے ذیل کی ہے۔

(الف) یہ کہ ڈگری استقراریہ و احکام امتناعی دوامی بحق مدعیہ بمقابلہ مدعاعلیہ بدین مضمون صادر فرمائے جائیں۔

(۱)۔ یہ کہ مدعیہ بموجب احکام شرع محمدی پردے کی ہرگز پابند نہیں ہے اور اس کو حق حاصل ہے جہاں اور جسکے پاس اسکا جی چاہے وہ بے پردہ جائے اور مدعاعلیہ کو ان امور میں کسی قسم کی مداخلت یا اعتراض کرنے کا قانوناً استحقاق نہیں ہے۔

(۲)۔ یہ کہ مدعیہ کو اختیار ہے کہ جس قسم کی وہ چاہے پوشاک پہنے خواہ اس سے ستر پوشی ہو یا نہ ہو۔

(۳)۔ یہ کہ مدعیہ کا فرض بچہ پیدا کرنا نہیں ہے۔ اور اگر باوجود نارضامندی مدعیہ بچہ یا بچے پیدا ہوں تو مدعیہ کو ایسے بچوں کی رضاعت۔ پرورش و تعلیم و تربیت سے کوئی سروکار و تعلق نہ ہوگا۔

(۴)۔ یہ کہ مدعیہ کو اپنے دوستوں سے تنہائی میں ملنے کا پورا حق حاصل ہے۔ خواہ وہ دوست مرد ہوں یا عورت اور مدعاعلیہ کو ان اوقات میں مدعیہ کے قریب آنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

(۵)۔ یہ کہ مدعیہ اپنے احباب مذکور اور خاصکر احباب ذکور سے حسب خواہش خط و کتابت کر سکتی ہے اور مدعاعلیہ کو مدعیہ کے خطوط کے لفافوں کو دور سے بھی دیکھنے کا کوئی حق اور اختیار نہیں ہے۔

(۶)۔ یہ کہ مدعیہ بعدم موجودگی مدعاعلیہ و بغیر ہمراہی مدعاعلیہ اپنے احباب مذکور اور خاصکر احباب ذکور کے ساتھ سیر کرنے یا سینما یا تھیٹر دیکھنے یا کسی

اور کام کرنے کے لئے پیدل یا موٹر یا کسی اور سواری پر باہر جا سکتی ہے

(۷) یہ کہ مدعاعلیہ کا یہ فرض قرار دیا جائے کہ وہ مدعیہ کے لئے ایک علٰحدہ بنگلہ خرید دے یا کرایہ پر لے اور بدون اجازت مدعیہ مدعاعلیہ کے بھائی بہن والدین اور دیگر رشتہ داروں کو اس بنگلے کی چہار دیواری کے ایک فرلانگ کے اندر آنیکا یا مدعاعلیہ کو انہیں بلانے کا اختیار نہ ہوگا۔

(۸) یہ کہ مدعاعلیہ کو ہدایت ہو کہ وہ اپنی تنخواہ کا ۳/۴ حصہ ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو آفتاب کے غروب ہوتے سے قبل تک مدعیہ کے حوالے کر دے اور اگر نہ کرے تو مدعیہ کو اختیار ہوگا کہ اس کی کُل تنخواہ فوراً قرق کرائے۔

(۹) یہ کہ مدعاعلیہ کو بذریعہ حکم امتناعی دوامی داڑھی یا مونچھیں رکھنے سے فوراً ممنوع فرمایا جائے۔ کیونکہ مدعاعلیہ کے اس فعل ناجائز سے مدعیہ کی سخت دل آزاری وحق تلفی ہوتی ہے۔

(۱۰) یہ کہ مدعاعلیہ کو ممانعت فرمائی جائے کہ بجز مدعیہ کے وہ کسی ۶۵ برس سے کم عمر کی عورت سے قولاً یا فعلاً کوئی سروکار، تعلق، میل جول یا اتحاد رکھے

(۱۱) یہ کہ مدعاعلیہ کو بذریعہ حکم امتناعی دوامی ممانعت فرمائی جائے کہ بجز کرم خوردہ بڑھیوں یا کریہ المنظر عورتوں کے کوئی جوان یا قبول صورت عورت بطور خادمہ کے گھر میں نہ رکھے اور نہ رکھنے کی نیت کرے۔

(۱۲) یہ کہ اس امر کا استقرار فرمایا جائے کہ انگریزی قاعدے سے گانا اور ناچنا نہ صرف شرعاً جائز ہے بلکہ طبی نقطہ نظر سے تندرستی کے لئے بیحد ضروری ہے۔ اور ان امور میں مدعاعلیہ کو کوئی قولی یا فعلی مزاحمت کرنیکا مطلقاً استحقاق نہیں ہے۔

(۱۳) یہ کہ مدعاعلیہ کو ہدایت ہو کہ وہ مدعیہ کو سال میں کم از کم چھ ماہ کے لئے پہاڑ پر بھیجے اور وہاں مدعیہ کی ہر ممکن وغیر ممکن ضروریات کا معقول انتظام کرے۔

(۱۴) یہ کہ مدعاعلیہ کو ہدایت ہو کہ وہ ہر اس زیور یا لباس کو جو کوئی عورت مدعیہ کے پاس پہنکر آئے یا جسکو مدعیہ کسی عورت کو پہنے ہوئے دیکھے مدعیہ کی فرمائش کے ایک ہفتہ کے اندر مہیا کر دے۔ اور اگر اندر میعاد معینہ مذکور مہیا نہ کرے تو مدعاعلیہ اس مدت تک سول جیل میں رکھا جائے جبتک وہ اشیاء مذکور حسب پسند مدعیہ فراہم نہ کر دے۔

(۱۵) یہ کہ اگر مدعیہ مہین ریشمی جانگیا پہنکر مردوں کیساتھ دریا میں نہائے یا ہاکی یا فٹ بال کھیلے یا مردوں کی طرح گھوڑے پر سواری کرے تو مدعاعلیہ مدعیہ کی ان خوش فعلیوں پر کسی حالت میں، نہ قولاً یا فعلاً کوئی اعتراض کرے اور نہ اعتراض کرنے کی صورت بنائے۔

(۱۶) یہ کہ مدعاعلیہ کو بذریعہ حکم امتناعی دوامی ممانعت فرمائی جائے کہ جب تک وہ مدعیہ سے کم از کم ۲۴ گھنٹے پہلے باتیں کرنے یا اس کے پاس بیٹھنے کی باقاعدہ اجازت نہ لے لے ہر گز افعال مذکورہ کے ارتکاب کی جرأت نہ کرے

(۱۷) یہ کہ مدعاعلیہ کو ممانعت فرمائی جائے کہ وہ ہر گز کسی صورت یا کسی ضرورت سے مدعیہ کو سونے سے نہ جگائے۔

(۱۸) یہ کہ اس امر کا استقرار فرمایا جائے کہ یہ مدعیہ مدعاعلیہ پر اسکی غیر فرمانبرداری۔ گستاخی۔ یا تساہل پر مبلغ ایکہزار روپیہ تک جرمانہ کر سکتی ہے۔

(۱۹) یہ کہ مدعاعلیہ کو ہدایت فرمائی جائے کہ وہ علاوہ اس وقت کے جب وہ کچہری میں سرکاری کام کر رہا ہو بقیہ اوقات پر مدعیہ کے بنگلے پر حاضر رہے اور بدون اجازت مدعیہ بنگلہ مذکور کی چہار دیواری کے باہر قدم رکھنے کی نیت نہ کرے

(۲۰) یہ کہ منجملہ امور مذکورہ دفعہ ہذا کے اگر مدعاعلیہ کسی فعل ممنوعہ کا ارتکاب کرے یا کسی فعل محکومہ کو حسب خواہش مدعیہ سرانجام نہ دے یا مدعیہ کے ان حقوق سے انکار کرنے کی صورت بنائے تو مدعیہ کو اختیار ہوگا کہ مدعاعلیہ کو فوراً طلاق دیدے اور اس کی تنخواہ حال وآئندہ اور اس کی کل جائداد منقولہ وغیر منقولہ بلا استثنا کسی شئے دعویٰ کے اسوقت تک قرق کر کے اپنے قبضہ وتصرف میں رکھے جب تک مدعیہ کسی دوسرے مرد سے حسب منشاء شرائط دفعہ ہذا نکاح ثانی نہ کر لے۔

(ب) یہ کہ خرچہ مقدمہ مدعیہ کو مدعا علیہ سے دلایا جائے۔

(ج) یہ کہ دیگر بامزید دادرسی جو بنظر حالات ونوعیت مقدمہ ہذا قرین انصاف عدالت ہو مدعیہ کو بمقابلہ مدعا علیہ عطا فرمائی جائے۔

فدویہ مسماۃ حوا خانم معروضہ یکم جنوری سنہ ۱۹۶۰ء

عرضی دعوے کو پڑھکر امیر القضاۃ ایک گہرے سوچ میں پڑ گئے۔ اور دیر تک خاموش رہے۔ پھر سر اٹھاکر مدعیہ سے پوچھا۔ "حوا خانم! کیا یہی وہ ناقابل انکار خداداد حقوق ہیں جن سے مدعا علیہ انکار کرتا ہے اور کیا یہ وہی ناقابل انکار خداداد آزادی ہے جسے مدعا علیہ تم سے چھیننے کی کوشش کرتا ہے"

حوا خانم:- (ہاتھ جوڑکر) جی حضور۔ انہیں حقوق اور اسی آزادی سے یہ ظالم انکار کرتا ہے (خوبصورت آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو لاکر) حضور خود فیصلہ فرمائیں۔ ظلم کی کوئی انتہا ہے۔ میں تو نیم جان ہورہی ہوں۔ میری جوانی برباد۔ میری زندگی حرام ہوگئی ہے۔ ہو! ہو! ہو! ہو! یہ کہکر بیچاری مظلوم حوا خانم زار و قطار رونے لگی۔

امیر القضاۃ:- حوا خانم روؤ نہیں تمہارے اس مقدمہ کا فیصلہ صرف خدا کرسکتا ہے جس نے بقول تمہارے یہ حقوق اور آزادی تمہیں دی ہے۔ لہذا آج یہ مقدمہ ہم ملتوی کرتے ہیں اور اللہ میاں سے استفسار کریں گے کہ وہ اس کا خود فیصلہ فرمائیں گے یا میرے سپرد کریں گے۔ آئندہ پیشی پر تمھیں معلوم ہوجائیگا کہ اس مقدمہ میں کارروائی کہاں ہوگی۔ فریقین کو پیشی آئندہ کی تاریخ کی اطلاع کردو۔ اجلاس برخاست ہوتا ہے"

یہ کہکر امیر القضاۃ کھڑے ہوگئے۔ اور جس دروازہ سے تشریف لائے تھے اسی دروازہ سے باہر چلے گئے۔ کچہری برخاست ہونے پر سارا مجمع منتشر ہوگیا اور میں بھی مسماۃ حوا خانم کو ایک آخری رخصتی نگاہ سے دیکھکر اُن کی مظلومیت انکے خداداد حقوق اور خداداد آزادی کے پامال ہونے کے مسئلے پر غور کرتا ہوا عدالت کے کمرے سے نکلا دور سے مجھے ایک نہر دکھائی دی۔ اور میں اسی نہر کی طرف تفریح کے خیال سے روانہ ہوگیا جب میں نہر کے کنارے پہونچا تو مجھے اس کے اردگرد کسی آبادی کا نشان نہ دکھائی دیا۔ بجز میرے نہ وہاں کوئی آدم تھا نہ آدم زاد۔ مگر نہر کے کنارے اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا دلفریب قدرتی مناظر کا لطف اٹھاتا نہیں معلوم کتنی دور چلا گیا۔ یک بیک مجھے کچھ عورتوں کے کھلکھلاکر ہنسنے اور قہقہہ لگانے کی آواز سنائی دی۔ میں چونک کر ادہر ادہر دیکھنے لگا مگر کوئی دکھائی نہ دیا۔ اتنے میں پھر وہی آواز فضا میں رقص کرتی ہوئی میرے کانوں میں پہونچی اب مجھے احساس ہوا کہ وہ آواز نہر کے اسی کنارے سے جس کنارے پر میں تھا آرہی ہے۔ میں آگے بڑھا۔ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ میں نے نہر کے کنارے ایک ایسا ہوشربا اور جاذب قلب ونظر منظر دیکھا کہ میں دم بخود ہوکر تصویر حیرت بنا جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔

میں نے دیکھا کہ نہر کے کنارے سنگ مرمر کی نہایت صاف شفاف اور بے انتہا خوبصورت سیڑھیوں کا ایک سلسلہ ہے جو اوپر سے لیکر دریا کے پانی کے نیچے تک چلا گیا ہے اور ان سیڑھیوں پر چالیس یا پچاس مختلف سن وسال کی عورتیں ہیں اور یہ سب مادر زاد برہنہ ہیں قسم کھانے کو بھی سر سے پاؤں تک اُن کے جسم پر کپڑے کا ذکر کیا ایک تار یا دھجی تک نہ تھی۔ اُن کے لمبے لمبے سیاہ سیاہ بال کسی کی کمر کسی کے پیروں تک لٹکتے ہوئے ہوا میں لہرا رہے تھے حسن وجمال اُن پر ختم تھا۔ بہترین بت تراشوں کی نقاشیاں ان حسین جادوگرنیوں کے سامنے گرد تھیں۔ مشہور ترین مصوروں کی صناعیاں ان ماہ پیکروں پر قربان کی جاسکتی تھیں۔ میں نے بچپن میں پریوں کے قصے بڑی بوڑھیوں سے سنے تھے اور قصے کہانیوں کی کتابوں میں پڑھے بھی تھے مجھے اُن کے وجود کا اقرار نہ تھا بلکہ میں منکر مطلق تھا مگر اس وقت میں اپنی آنکھوں کی شہادت کو کیسے جھٹلا سکتا تھا۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ جو آدم زاد پریوں کو دیکھتا ہے پھر وہ بچتا نہیں یا تو دیوانہ ہوجاتا ہے یا مرجاتا ہے میں کچھ خوف۔ کچھ حیرت۔ کچھ اس منظر کی دلفریب جاذبیت کی وجہ سے برف کی ایک مورت کی طرح منجمد ہوکر رہگیا۔ دل میں میرے بھاگنے کا خیال آیا۔ میں نے ارادہ بھی کیا۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے پیروں میں اور نہ صرف

پیروں میں بلکہ سارے جسم میں کسی نے دفعتاً سیسہ بھر دیا ہو۔ پیر اٹھانے یا ہاتھ ہلانے کی طاقت ہی گویا معطل ہو گئی تھی۔ اس پریوں کے غول میں کوئی نہا رہا تھا کوئی بال سکھا رہا تھا کوئی گا رہا تھا۔ کوئی ہنس رہا تھا۔ کوئی کیا کر رہا تھا۔ کوئی کیا۔ دفعتاً ایک نہایت حسین کمسن شوخ چشم پری جو اس غول میں کالبدر فی النجوم تھی مجھے دیکھکر چونکی اور پھر انتہائی تعجب سے انگشت بدنداں میری طرف کچھ دیر تک ٹکٹکی لگائے دیکھتی رہی مجھے دو باتوں پر سخت حیرت ہوئی۔ ایک تو یہ کہ باوجود برہنہ ہونیکے مجھے اپنی طرف دیکھتا ہوا دیکھ کر وہ ذرا بھی نہیں جھجکی اور دوسرے یہ کہ اس کو میری طرف اتنی دیر تک دیکھنے کی بظاہر کوئی ایسی خاص وجہ نہ تھی کیونکہ باوجود اپنی ذاتی خوش اعتقادی کے میں کوئی یوسف کنعاں نہ تھا۔ یکبیک وہ خوف زدہ ہو کر چیخی۔ اس کی چیخ پر دس بارہ پریاں اس کے پاس دوڑتی ہوئی آئیں۔ اُس نے میری طرف اشارہ کیا سب میری طرف دیکھنے لگیں اور کچھ دیر تک نظر استعجاب سے مجھے دیکھا کیں۔

وہی پہلی پری:۔ کیا یہ شخص زندہ ہے یا کسی پرانے مردے کی روح ہے۔

دوسری پری:۔ زندہ تو نہیں معلوم ہوتا۔ ضرور کسی مردے کی روح ہے۔؟

تیسری پری:۔ نہیں! زندہ ہے! اس کی آنکھیں مُردوں کی سی نہیں ہیں۔ اور مُردوں کی روحیں شروع صدی کے انگریزی کپڑے پہنکر نہیں آتیں مگر پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کون شے ہے۔

چوتھی پری:۔ (جو ذرا نڈر تھی) چلو نا۔ قریب چلکر دیکھیں۔ آدمی ہی تو ہے۔ شیر تھوڑی ہے جو کھا جائیگا۔

پانچویں پری:۔ توبہ کرو۔ میں تو ہرگز نہ جاؤنگی۔

پہلی پری:۔ (جس نے مجھے شروع میں دیکھا تھا) ہاں! ہاں! چلو۔ قریب سے چلکر دیکھیں۔ پرانے زمانے کی یادگار ہے ضرور دلچسپ ہوگا۔ یہ کہکر باوجود اوروں کی ممانعت کے وہ پہلی پری اور چوتھی پری جو نسبتاً نڈر تھی آہستہ آہستہ میرے قریب آئیں میں پتھر کی مورت کی طرح ساکت وصامت کھڑا ہوا تھا۔ جب وہ مجھ سے صرف ڈیڑھ یا دو گز رہ گئیں تو میری آنکھیں اُن کے حسن برہنہ کی تابناکی دیکھ نہ سکیں بشرم سے جھک گئیں اور اور پھر نہ اٹھیں اسپر وہی پہلی پری تعجب کے لہجے میں بولی۔ زندہ ہے! زندہ ہے! ضرور زندہ ہے۔ آنکھیں اٹھائے دیکھ رہا تھا۔ ہم دونوں کے قریب آنے پر نظر جھکالی تم نے دیکھا تھا؟"

مس مکبل[1] (چوتھی پری) ہاں۔ ہاں۔ بہن میں نے بھی دیکھا تھا۔ تم سچ کہتی ہو یہ زندہ ہے۔ اور یہ کہکر وہ دونوں مجھے ایسی دلچسپی اور حیرت سے دیکھنے لگیں جیسے کوئی سیاح کسی پرانی یادگار کو دیکھتا ہے پھر..... خاتون (پہلی پری) نے کہا۔ بس بس میں سمجھ گئی یہ شخص بیسویں صدی کی پہلی ربع کا ہے بعینہ اسی قسم کی تصویریں میں نے اپنی ہسٹری کی کتاب میں دیکھی ہیں۔ بالکل یہی وضع قطع! ۔ اس زمانے کے لوگ بھی کیسے احمق اور کندۂ ناتراش ہوتے تھے۔ انہیں جسم کو کپڑوں سے ڈھکنے کا مرض تھا۔ سمجھتے تھے یہی تہذیب کا معیار ہے یہی ترقی کی کسوٹی ہے۔

!!! ہا! ہا! ہا! ان احمقوں کو جرمنی کے سوپرمین خان ہرٹ زاگ کے قانون فطرت کا فلسفہ تو خواب میں بھی نہ دکھائی دیا ہوگا اُسے سمجھا تو دوسری بات ہے!

مس مکبل:۔ واہ! تم بھولتی ہو! اٹھارویں صدی میں فرانس کے مشہور فلسفی جین جیکو روسے نے مذہب فطرت کی بانگ دی تھی اور بیسویں صدی کی پہلی ربع میں کہیں کہیں اس مذہب کے معتقد بھی پیدا ہو گئے تھے۔

[1] مکبل لفظ مقبول کی ترقی ہے۔

..... خاتون :- ہاں ہاں ہوگا۔ مگر ذرا پوچھئے تو ان احمقوں سے کہ جس حالت میں تمھیں قدرت نے پیدا کیا اسی حالت میں رہنا اچھا اور فطرت سے قریب تر ہے یا مصنوعی کپڑے پہنکر اپنی قدرتی صحت کو خراب کرنا اور اپنے جسم کی قدرتی خوبیوں کو چھپانا؟..... اور بتاؤ بہن اگر کپڑوں سے جسم کو ڈھکنا ہی تقاضائے حیا ہوتا تو قدرت نے انسان کو کپڑے پہنا کر کیوں نہیں پیدا کیا-؟ برہنہ کیوں پیدا کیا؟ واقعہ یہ ہے کہ ہم فطرت سے دور پڑ گئے تھے اور تصنع کے اندھے معتقد ہو گئے تھے۔ پھر جس قدر تہذیب ترقی کرتی گئی ہم فطرت سے قریب تر ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ایک وہ زمانہ آیا کہ زندگی کے صحیح اصول اور آزادی کا صحیح مفہوم ہم پر مثل اور مادی حقیقتوں کے منکشف ہوگیا۔ اور ہم صحیح اور حقیقی معنوں میں تہذیب اور علم کی گہرائیوں سے آگاہ ہو گئے۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ یہی علم و تہذیب کی معراج اور یہی ترقی اور فلسفہ کا نقطۂ کمال ہے۔

جب میں نے ان پریوں کو اردو میں گفتگو کرتے سنا تو مجھے سخت اچنبھا ہوا۔ پھر جب انکی اور باتیں سنیں تو رفتہ رفتہ میرا یہ وہم کہ یہ پریاں ہیں رفع ہوتا گیا یہاں تک کہ مجھے یقین ہوگیا کہ یہ پریاں نہیں ہیں انسان ہیں۔ اور جس وقت مجھے اس کا یقین ہوگیا اس وقت گو میری حیرت کم نہ ہوئی مگر میرا ڈر جاتا رہا۔ اور میرے جسم میں وہ جمود اور ناطاقتی جو پیدا ہوگئی تھی تبدریج کافور ہوگئی۔

..... خاتون :- (مجھ سے مخاطب ہوکر) تم اتنے کپڑے پہنے ہو تمہیں الجھن نہیں ہوتی؟ تم کیسے رسم و رواج کے بے بس غلام ہو؟ تمہیں شرم نہیں آتی؟..... ہم کو دیکھو! ہم کیسے آزاد اور مہذب ہیں۔..... ہم نے زندگی کے وہ سربستہ راز دریافت کر لئے۔ جہاں تک کسی کا ابتک وہم و گمان بھی نہیں پہونچا تھا۔ زندگی کا نام آزادی۔ اور آزادی کا نام زندگی ہے اور جس قسم کی تمہاری زندگی ہے وہ حیات وحوش سے صرف ایک درجہ بالاتر ہے۔ اس سے زیادہ قابل ترجیح تو موت ہے۔ تم سمجھتے بھی ہو کہ آزادی کے معنی کیا ہیں؟

میں نے بولنے کی کوشش کی۔ ایکبارگی میری زبان کھل گئی اور میں نے جواب دیا:" اے حسن سحر کار کی برہنہ تصویر! آزادی کے معنے میں ابتک صرف اخلاقی برہنگی سمجھتا تھا۔ مگر مجھے آج معلوم ہوا کہ جسمانی برہنگی بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے۔

..... خاتون :- (میرے کاندھے پر اک عجیب شان دلربائی سے ہاتھ رکھکر اور مسکرا کر) تو پھر اے ذہین بیوقوف! تو کیوں یہ ایک گدھے کا بوجھ جسم پر لادے ہے۔

میں :- اس لئے کہ کسی بات پر اڑے رہنا گدھے کے جملہ اوصاف حمیدہ میں سب سے شاندار وصف ہے!

..... خاتون :- (ہنسکر) اچھا تو اب آ۔ یہ کپڑے اتار کر پھینکو! سچی تہذیب کے آفتاب کی روشنی میں چلکر کھیلو زمانۂ جاہلیت کے بہیمانہ اور وحشیانہ خیالات تہ کر کے طاق پر رکھدو۔ مذہب فطرت اختیار کر لو اور انسان کامل بن جاؤ۔ (میری آستین پکڑکر) چلو۔ اب پس و پیش نہ کرو۔ یہ لباس وحشیانہ اتار دو اور ہمارے حلقہ میں داخل ہو جاؤ۔

میں :- (گھبرا کر) مجھے مہلت دو۔ خدا کے لئے مجھے کچھ دیر کی مہلت دو! میں تمھاری جدید تہذیب کا فلسفہ ابھی کچھ اور سمجھ لوں پھر تمھارے حلقہ میں داخل ہوں۔

..... خاتون :- کسی فلسفے کے سمجھنے کا بہترین طریقہ اس کی عملی تقلید ہے..... اے سچ کہنا۔ کیا تمہارے زمانے میں واقعی لڑکیاں کپڑے پہنتی تھیں اور کپڑے پہننا تقاضائے حیا سمجھتی تھیں؟

میں :- ہاں سمجھتی تو تھیں۔ کیسے کہوں کہ نہیں سمجھتی تھیں۔

..... خاتون :- (ہنسکر) تو پھر اگر ہم تمہارے زمانے میں ہوتے تو ہم بہت ہنسے جاتے۔

میں :- (مسکرا کر) ہاں ہنسی تو جائیں کیونکہ ہمارے زمانے میں لباس عریانی صرف جانوروں کا لباس تھا۔

.... خاتون :- (ہنس کر) بڑا جاہل زمانہ تھا۔ مگر کیا اس زمانے میں مغربی فلسفہ اور تہذیب ہندوستان میں رائج نہیں ہوئی تھی۔

میں :- نہیں تو! رائج تو ہوگئی تھی مگر اس قدر نہیں جتنی کہ آج کل ہے۔ وہ مغربی تہذیب کی ابتدا تھی۔ یعنی اس وقت عورتیں پردے سے باہر نکلنے کی نہایت سرگرمی سے جدوجہد کر رہی تھیں۔ اور یہ اس کی انتہا ہے۔

.... خاتون :- بیشک ہماری آج کل کی تہذیب اخلاقی و معاشرتی ارتقا کی آخری منزل ہے!

میں :- آپ بجا فرماتی ہیں۔ بہیمیت سے نکل کر نقطۂ کمال تک پہونچنا اور پھر بہیمیت کی طرف لوٹ جانا تہذیب انسانی کا مشہور ارتقائی چکر ہے۔ مگر یہ تو میں نے آپ سے پوچھا نہیں کہ یہ ہے کون سا سن اور آپ کون ہیں اور یہ ملک کس کا ہے۔

.... خاتون :- ہم ۱۹۹۵ء کے ہندوستان کی جمہوریت کے شریف گھرانوں کی مستورات ہیں

میں :- ۱۹۹۵ء؟ آپ غلطی کر رہی ہونگی۔ اس حساب سے تو میری عمر سو سال کے قریب ہو جاتی ہے۔ حالانکہ میرے بال بھی سفید نہیں۔

.... خاتون :- ہاں اسمیں تو شک نہیں کہ تمھاری عمر زیادہ نہیں معلوم ہوتی مگر اسمیں بھی شک نہیں کہ یہ ۱۹۹۵ء ہے (میرا ہاتھ پکڑ کر) اچھا تو پھر چلو۔ اتار و کپڑے۔ چلکر نہر میں نہائیں۔ اور یہ کہکر اس نے اپنی انگلی سے ایک خوبصورت ہیرے کی انگوٹھی نکال کر میرے ہاتھ میں پہنا دی

میں :- یہ کیا؟

.... خاتون :- کچھ نہیں۔ اب تم میرے ساتھ چلو۔

میں :- (بہانہ کر کے) مجھے اس وقت بیحد ضروری کام ہے میں اسے کر آؤں پھر آپ سے آکر اطمینان سے باتیں کرونگا۔ بس یہی ڈیڑھ دو گھنٹہ میں واپس آجاؤنگا۔

.... خاتون :- (کھلکھلا کر ہنسی) اب تم کہاں جا سکتے ہو! اب تمہیں یہیں رہنا ہوگا۔

میں :- (کچھ پریشان ہوکر) کیوں؟

.... خاتون :- اس لئے کہ آج کل قانون یہی ہے میں نے اتنی بہت سی عورتوں کے سامنے انگوٹھی پہنا دی ہے حالانکہ قانوناً صرف دو مرد دو یا ایک عورت کے سامنے انگوٹھی پہنا دینا کافی ہے۔

میں :- یہ کیا؟ انگوٹھی پہنا دینے سے کیا ہوتا ہے؟ ہوش کی باتیں کرو۔

.... خاتون :- میرے بھولے شوہر! تم زیادہ پریشان نہ ہو۔ میں تمھیں رفتہ رفتہ سب سمجھا دونگی۔

میں :- (حیرت سے) بھولے شوہر؟ یہ کیا؟ تم غلطی کر رہی ہو میں تمھارا شوہر نہیں ہوں۔

.... خاتون :- (مسکرا کر) نہیں! تم ہی غلطی کر رہے ہو۔؟ اور اگر تمھیں اب بھی یقین نہ ہو تو ان عورتوں سے پوچھکر اپنا شک رفع کر لو۔

مس مکھیل اور بقیہ سب عورتیں :- (ایک آواز ہو کر) ہاں ہاں ثریا بالکل ٹھیک کہتی ہے۔ تم اس کے شوہر ہوا اور ہم سب گواہ ہیں کہ اس نے تم کو ہمارے سامنے انتخاب کیا ہے۔

میں :- مگر یہ نکاح ہرگز جائز نہیں۔ میں نے ابتک اپنی رضامندی نہیں دی ہے۔

.... خاتون :- تم کس قدر بھولے اور ناسمجھ ہو! میرا تم کو انگوٹھی پہنا دینا اور تمھارا خاموشی سے انگوٹھی پہن لینا تمھاری رضامندی کا بین ثبوت ہے

میں :- مگر میں اس قانون سے واقف نہ تھا؟ اور نہ عقلاً کوئی قانون ایسا مہمل ہو سکتا ہے!

..... خاتون :- قانون تو یہی ہے! اور یہ ایک مشہور قانونی اصول ہے کہ قانون سے ناواقفیت کوئی عذر نہیں" میں لاجواب ہوگیا۔ میرا دماغ چکر کھا رہا تھا میں سوچنے لگا کہ یہ تو بڑا غضب ہوا۔ میرے گھر کے لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے! اور ایسی آزاد خیال بیوی سے شادی کرکے میں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ ہونگا۔ سخت بدنامی بڑی جگت ہنسائی ہوگی۔ یا اللہ میں کہاں آکر پھنس گیا" دفعتاً میرے دماغ میں ایک تدبیر بجلی کی طرح چمکی۔

میں :- اچھا تو قانون کا جواب قانون سے دیا جائیگا۔ میں نے مانا کہ قانوناً میں تمھارا شوہر ہوگیا اور تم میری بیوی ...... مگر چونکہ مجھے طلاق دینے کا بھی حق ہے لہذا اس حق کا فائدہ اٹھا کر میں تمھیں طلاق دیتا ہوں۔

..... خاتون :- (قہقہہ لگاکر) ذہین بیوقوف! تم کہاں تک مجھ سے کج بحثی کروگے!! ہا! ہا! ہا!

میں :- ذہین بیوقوف! ...... تم خود بیوقوف ذہین ہو!

..... خاتون :- (ہنستے ہوے) سنو! تم مجھے چھ مہینہ تک طلاق نہیں دے سکتے۔ اس کے بعد دے سکتے ہو بشرطیکہ میں بھی اس پر راضی ہوں اور میں جب چاہوں تمھیں طلاق دے سکتی ہوں۔

میں :- (خفا ہوکر) یہ بالکل مہمل قانون ہے اور میں اس کا پابند نہیں۔

..... خاتون :- جب تک تم ہماری جمہوریت میں ہو تمھیں اس قانون کا پابند ہونا پڑے گا۔ اور رہی یہ بات کہ قانون مہمل ہے تو یہ کوئی عذر ہی نہیں کیونکہ جب کوئی بات کسی کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے۔ تو وہ اُسے مہمل کہکر اپنے دل کو بہلا لیتا ہے۔ میرے شوہر! اب زیادہ کج بحثی نہ کرو تم مجھ سے پیش نہ پاؤگے جلوہ دیر ہوتی ہے۔

میں :- (لاجواب اور مجبور ہوکر) اچھا تو اب میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ تم خود مجھے اس قانونی قید سے رہا کردو۔ تم خود مجھے طلاق دیدو کیونکہ تم کہتی ہو کہ تمھیں یہ حق ہر وقت حاصل ہے۔

..... خاتون :- یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر بہت سے حقوق ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا نفاذ نہیں کیا جا سکتا۔

میں :- میں پرانے زمانے کے وحشیوں کی ایک یادگار ہوں۔ تمھارے کس کام کا۔ تم کو ۲۴ گھنٹہ میں ۲۴ شوہر مجھ سے بہتر مل سکتے ہیں۔ لہذا مجھے طلاق دینے میں تمھارا کوئی نقصان نہیں۔

..... خاتون :- میرے نقصان یا فائدہ کا تم فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہو۔ یہ صرف میرا حق ہے۔ اور تمھارا پرانے وحشیوں کی یادگار ہونا ہی تمھاری بہترین سفارش ہے کیونکہ آج کل کے مردوں میں خواہ کوئی بھی صفت ہو مگر یہ صفت نہیں ہو سکتی۔

میں :- (زچ ہوکر) اچھا تو پھر میں اسی وضع میں رہوں گا۔! تمھاری تہذیب نہیں اختیار کرونگا۔

..... خاتون :- (مسکراکر) یہ کیوں؟

میں :- (حاکمانہ لہجہ میں) اس لئے کہ یہ میری مرضی ہے

..... خاتون :- ہا! ہا! ہا! تمھاری کوئی مرضی نہیں ...... مرضی صرف میری ہے۔ اور میری ہی مرضی تمھارا قانون ہے

میں :- تو کچھ ہو جائے میں کپڑے نہیں اتارونگا۔

..... خاتون :- (مسکراکر) کیوں؟

میں :- مجھے شرم آتی ہے!

..... خاتون :- (دوسرا قہقہہ لگاکر) شرم! ______ شرم ہے کس چڑیا کا نام؟ تم سمجھتے بھی ہو کہ شرم کیا ہے شرم محض ایک خاص خیال ہے جسمیں انسان نے تربیت پائی ہو۔ اسی لئے ہر قوم۔ ہر طبقہ۔ ہر زمانہ اور ہر ملک کی شرم کا معیار اور مفہوم جداگانہ ہوتا ہے۔ شکسپیر نے کیا خوب کہا ہے کہ دنیا میں نہ کوئی چیز اچھی ہے نہ بری یہ ہمارا خیال ہے جو اسے اچھا یا برا بنا دیتا ہے۔ کس قدر سچا مقولہ ہے۔ اب یہی دیکھو کہ اگر میں تمھارے زمانے میں یونہی آزادی سے برہنہ تن پھرتی تو شاید وہ وحشی لوگ مجھے بے شرم کہتے۔ حالانکہ

آج کل کی تہذیب میں جس خیالی محبوب کو شاعر شرم وحیا کی دیوی کہہ کہہ کر پکارتے ہیں اس کو بھی اشعار میں میری ہی طرح برہنہ باندھتے ہیں۔..... شرم! قسم ہے خدائے فطرت کی۔ ہے یہ وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا۔ شرم اسی وقت تک رہتی ہے جب تک کوئی شخص کسی قول یا فعل کا عادی نہیں ہوتا۔ مگر عادی ہوجانے کے بعد وہی قول یا فعل جس سے شرم کے پسینے آتے تھے انسان بے تکلف اور بے حجاب کرنے لگتا ہے۔ پھر تم ہی بتاؤ کہ شرم کی خصوصیت ہی کیا رہی۔........ بس آج سے میرے سامنے شرم کا فلسفہ نہ بگھارنا۔ کیونکہ شرم وحیا سب زمانہ جاہلیت کے احمقانہ چوچلے ہیں جو خدا خدا کرکے اب کہیں متروک ہوئے ہیں۔

میں:۔ (عاجز آکر) اچھا تو دو چار دن کے لئے تو مجھے یہ کپڑے پہنے رہنے دو۔ اس کے بعد جو کہوگی وہ کروں گا

.....خاتون:۔ خیر اتنی رعایت ہوسکتی ہے۔

میں:۔ بڑی بات۔ اس مہربانی کا شکریہ۔ میری عقل اسوقت کام نہیں کرتی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں تم خدا کے لئے مجھے سمجھا دو یہ کیا ماجرا ہے!۔

.....خاتون:۔ اچھا چلو وہیں نہر کے کنارے چلکر بیٹھیں۔ وہیں۔ اطمینان سے بیٹھکر باتیں کریں گے۔ چنانچہ ہم دونوں سنگ مرمر کے زینوں پر جاکر الگ ایک طرف بیٹھ گئے۔ مس مکبل اور بقیہ عورتیں ہم دونوں کو اکیلا چھوڑ کر دوسری طرف چلی گئیں۔

.....خاتون:۔ ہاں تو تم کیا پوچھتے ہو۔

میں:۔ یہی کہ یہ حیرتناک انقلاب ہندوستان کے اخلاق معاشرت اور تمدن میں کیونکر پیدا ہوگیا۔

.....خاتون:۔ یہ کون بڑی بات ہے۔ سنو جس طرح مادی دنیا میں قانون ارتقا جاری ہے اسی طرح انسانی خیالات تہذیب۔ فلسفہ معاشرت تمدن۔ اخلاق کو بھی جادۂ ترقی میں ارتقا کی منزلیں طے کرنا پڑتی ہیں۔ دنیا کی زندگی کے کسی شعبہ پر غور کرو۔ یہی قانون کارفرما نظر آئیگا چنانچہ ایک زمانہ تھا کہ عورتیں محکوم ومظلوم تھیں۔ پھر ایک زمانہ آیا کہ علم وتہذیب کا آفتاب مغرب سے بلند ہوا اس کی تیز شعاعیں ہندوستان کی سرزمین پر بھی ضیافگن ہوئیں۔ عورتوں کی مجہول زندگی میں آثار حیات نمودار ہونے لگے۔ وہ اپنی ازلی قید بے زنجیر سے آزاد ہونے کے لئے جدوجہد اور کشمکش کرنے لگیں۔ ایک عرصہ تک مذہب کے مستحکم بند نے انقلاب کے سیلاب کو روکا مگر بالآخر عورتوں کو ہزاروں ٹھوکریں کھاکر سیکڑوں تلخ تجربات کے بعد عقل آئی۔ انکی آنکھیں کھلیں اور ان پر یہ راز منکشف ہوگیا کہ مذہب صرف نیم وحشی قوموں کو ڈرانے یا بہلانے کے لئے ضرورتاً ایجاد کیا گیا تھا۔ جب قومیں ترقی کے اونچے اونچے زینوں پر پہونچ گئیں اور مذہب کی ضرورت مفقود ہوگئی تو روشن خیال اور تعلیم یافتہ قوموں نے یہ فیصلہ کردیا کہ اس دقیانوسی آہنی شکنجے کو پرانی چیزوں کے عجائب خانے میں بطور اگلے زمانے کی ایک یادگار کے رکھدینا چاہئے۔ اور قدرت کو اپنا خدا۔ عقل کو اپنا پیغمبر اور آزادی کو اپنا مذہب قرار دیکر علم وترقی کے بلند زینوں پر چڑھنا چاہئے۔ عورتوں نے بھی یہی مسلک اختیار کرکے پہلے وید اور قرآن کی تاویلیں شروع کیں۔ پھر رفتہ رفتہ ضروریات زمانہ کے لحاظ سے ان پرانی کتابوں کی مناسب ترمیم اور تنسیخ بھی ہوگئی۔ ابلتے ہوئے سیلاب ترقی نے مذہب کے بند کو توڑ ڈالا۔ اور عورتیں مردوں کی حکومت سے آزاد ہوگئیں۔ پردہ (ترقی کی راہ میں پہلا سنگ گراں) بذریعہ قانون ایک مستقل جرم قرار دیدیا گیا۔ عورتوں کو زندگی کے ہر شعبہ میں وہی حقوق دیدئے گئے جو مردوں کو حاصل تھے۔ نکاح کے احمقانہ قواعد منسوخ کردئے گئے اور نئے اور نہایت سہل ومختصر قواعد نکاح کے وضع کئے گئے جس کا تمہیں تھوڑا بہت آج ذاتی تجربہ بھی ہوگیا طلاق دینے کا حق مردوں سے چھین لیا گیا اور عورتوں کو دیدیا گیا۔ رفتہ رفتہ مذہب فطرت کی اشاعت بھی شروع ہوگئی۔ وید اور قرآن ناکافی اور مانع ترقی قرار پاکر منسوخ کردئے گئے۔ اور مذہب فطرت سارے ملک کا مذہب ہوگیا۔ ہر متنفس کا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بچہ ہو یا بوڑھا قانونی فرض ہوگیا کہ وہ برہنہ رہے۔ چنانچہ ابتدا میں اخلاقی جرائم کی ضرور شدت اور کثرت ہوگئی مگر جوں جوں لوگ برہنگی کے عادی ہوتے گئے۔ اخلاقی جرائم بھی کم ہوتے گئے یہاں تک کہ اب قریب قریب معدوم اور مردوں اور عورتوں کے اخلاق بمقابلہ زمانۂ سابق کے قابل تحسین اور لائق صد آفریں ہیں۔ گورنمنٹ کے حکم سے فوج میں عورتوں کی بھی بھرتی ہونے لگی۔ اور انہیں کمیشن بھی ملنے لگا۔ چنانچہ آج کل ہندوستان کی بارہ لاکھ فوج میں

ساڑھے سات لاکھ عورتیں ہیں۔ اور تمہیں سنکر تعجب ہوگا کہ آج کل ہندوستان کی سپہ سالار ایک عورت ہے جس کا نام شکنتلا دیوی ہے ہندوستان کی جمہوریت کی پریسیڈنٹ آج کل ایک عورت ہی ہے جس کا نام زہرہ سلطانہ ہے۔ نکاح کا قاعدہ یہ ہے کہ عورت جس مرد کو پسند کرے اس کو وہ دو مردوں یا ایک عورت کے سامنے اپنی انگوٹھی پہنادے۔ مرد کی رضامندی اگر ہو تو فبہا ورنہ کوئی ضرورت نہیں۔ صرف دو صورتوں میں مرد شادی سے انکار کرسکتا ہے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ عورت کے جسم کا کوئی عضو مقطوع یا مجروح یا مفقود ہو مثلاً عورت اندھی ہو یا لولی ہو یا کانی ہو یا نکٹی ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ عورت کسی متعدی مرض میں مبتلا ہو۔ مثلاً اسے برص ہو یا تپ دق ہو بس یہی دو صورتیں ہیں جن میں مرد انکار کرسکتا ہے ورنہ عورت کے انگوٹھی پہنادینے سے نکاح قطعی اور مکمل ہوجاتا ہے۔ نکاح کے چھ ماہ تک مرد کو طلاق دینے کا مطلق کوئی حق نہیں اور بعد چھ ماہ کے وہ طلاق دے سکتا ہے۔ بشرطیکہ عورت راضی ہو اور عورت ہر وقت طلاق دے سکتی ہے اور عورت ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ نکاح بھی کرسکتی ہے۔

میں:۔ (تعجب سے) ایک سے زیادہ؟ یعنی کتنے؟

......خاتون:۔ کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ مگر عموماً ہمارے زمانے کی عورتیں ایک وقت میں دس بارہ مردوں سے زیادہ نکاح نہیں کرتیں اور یوں اپنی اپنی طبیعت ہے۔ بعض عورتیں اس سے زیادہ بھی نکاح کرلیتی ہیں۔ مثلاً زہرہ سلطانہ کے آج کل ۸۰ شوہر ہیں۔ اور شکنتلا دیوی کے ۵۵ ہیں یا ۵۷ مجھے ٹھیک یاد نہیں۔

میں:۔ اور مرد؟ مرد کے نکاح کرسکتا ہے؟

......خاتون:۔ مرد نکاح ہی نہیں کرسکتا۔ وہ نکاح نہیں کرتا۔ اس سے نکاح ہوتا ہے۔ میں نے تم سے ابھی کہا نہیں کہ عورتیں مردوں کو پسند کرکے ان سے نکاح کرلیتی ہیں۔ بڑا لطف آتا ہے۔ جیسے پہلے زمانے میں قصائی قربانی کے بکرے ایک کثیر تعداد میں لے آتے تھے اور لوگ اس میں سے قربانی کے لئے پسند کرلیتے تھے اسی طرح آج کل جب کسی لڑکی کو شادی کرنا ہوتی ہے تو وہ کوتوال شہر کو لکھدیتی ہے کوتوال شہر دو چار سو مرد جنکر لڑکی کے گھر بھجدیتا ہے۔ لڑکی دیکھ بھال کر ایک دو۔ دس۔ پانچ جتنے شوہروں کی اُس کو ضرورت ہوتی ہے پسند کرلیتی ہے۔

میں:۔ تو ایسی صورت بھی پیدا ہوتی ہوگی کہ ایک ہی مرد کو کئی عورتیں پسند کریں۔

......خاتون:۔ ہاں! ہاں بہت! مگر ایسی صورت میں پولیس میں باضابطہ اطلاع کردینا ہوتی ہے تاکہ فساد یا نقص امن کا اگر کسی حالت احتمال ہو تو عورتوں کے مچلکے لے لئے جاویں۔

میں:۔ اور بچوں کی رضاعت پرورش اور تعلیم وتربیت کا کیا انتظام ہوتا ہے۔

......خاتون:۔ پہلے ماں کا حق ہے پھر اس کے شوہروں کا اور ان میں اگر باہمی تصفیہ نہ ہو تو قرعہ ڈالکر تصفیہ کرلیا جاتا ہے کہ کون شوہر بچے کی پرورش کریگا۔ اور اگر ماں اور اس کے شوہر انکار کردیں تو گورنمنٹ کی طرف سے انتظام ہوتا ہے۔

میں:۔ عجب قانون ہے!!

......خاتون:۔ اس میں کیا شک ہے؟ یعنی اب یہی سمجھ لو کہ اس کی خوبی کا اس سے بہتر کیا ثبوت ہوگا کہ اخلاقی جرائم کا تو کہیں نام ونشان ہی یہاں نہیں رہا۔ سوسائٹی کے دامن پر جو بہت سے بدنما دھبے تھے مثلاً ناجائز بچے۔ بازاری عورتیں بیویوں پر شوہروں کے مظالم وغیرہ وغیرہ ایسے دہل گئے کہ گویا جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔ بیشک تہذیب وترقی آج کل معراج کمال پر ہے۔

میں:۔ (دفعتاً کچھ یاد کرکے) مگر ثریا میں نے تم سے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں تمھارا کون سا شوہر ہوں۔

ثریا کے رخسار آتشین کی سرخی ذرا اور جھک گئی۔ آنکھیں قدرے جھک گئیں۔ اور مجھے شبہ ہوا کہ ثریا شاید شرما گئی۔

میں:۔ ثریا تم نے جواب نہیں دیا۔

......ثریا خاتون:۔ (شرما کر) تم میرے پہلے شوہر ہو

میں :- (ہنسکر) جھوٹ!

.....ثریا خاتون :- نہیں میں سچ کہتی ہوں - تمہارے سر کی قسم!

میں :- اس کا ثبوت؟

.....ثریا خاتون :- اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہمارے یہاں قاعدہ ہے کہ ہر شادی شدہ عورت اپنے گلے میں موتیوں کا ایک ہار ہر وقت پہنے رہتی ہے اور جتنے شوہر اس کے ہو چکے ہوتے ہیں اتنے ہی موتی اس کے ہار میں ڈال دئے جاتے ہیں جیسے جیسے شوہروں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے - موتیوں کی تعداد اور ان کی لڑوں میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے - ان سب عورتوں کو دیکھو - ہر ایک کے گلے میں موتیوں کے ہار پڑے ہیں - اور مجھے دیکھو میرے گلے میں کوئی ہار نہیں - مجھے میرا ہار کل صبح پہنایا جائیگا - اور اس میں صرف ایک موتی ہوگا یہ کہکر اس کی گردن حیا سے خم ہو گئی اس کی برق ساں نگاہیں خود بخود جھک گئیں - اور بالکل ہمارے زمانے کی شریف لڑکیوں کی طرح شرماکر خاموش ہو گئی -

میں :- ثریا! میں خوش ہوں کہ ابھی تم میں شرم و حیا کی کچھ چنگاریاں باقی ہیں - ابھی تمہدے زمانے کی کامل تہذیب سے تمہاری نسائیت کی شہ رگ نہیں کٹی ہے - میری ثریا اب بھی موقع ہے اس تہذیب حیا سوز کی ابھی تمہیں ایسی آنچ نہیں لگی ہے کہ تمہارے زخم مندمل نہ ہو سکیں اب بھی تم بچ سکتی ہو اور ثریا مجھے اجازت دو کہ میں تمہیں بچا لوں - تم نسائی حسن کی جیتی جاگتی تصویر ہو مگر وہ جوہر جسے نسائیت کہتے ہیں اگر تم کھو بیٹھیں تو تم سے اچھی پتھر کی وہ برہنہ مورتیں ہونگی جو بُت تراش تراشتے ہیں - اور جنکو شوقین نوجوان اپنے ڈرائنگ روم کو سجانے کے لئے خرید لیتے ہیں - تم ایک خوبصورت پھول ہوگی مگر ایسا پھول جسمیں رنگ و بو نہ ہو - تم ایک پر سرور نغمہ ہوگی مگر ایسا نغمہ جسمیں الحان و ترنم نہ ہو - تم جو کچھ بھی ہو جاؤ مگر عورت نہ ہوگی - تم صرف ایک دلچسپ کھلونا ہو جاؤ گی جس سے مرد کچھ دیر تک ہنس ہنس کر کھیلینگے اور پھر اکتا کر دشکن لاپروائی سے کہیں پھینکدینگے اور پھر دوسرے کھلونے کے خریدار ہو جائیں گے - ثریا! خدا کے لئے مجھکو تمہیں بچا لینے دو - تم میرے ساتھ چلو - اس مکروہ فضا سے نکل آؤ اور اس فضا میں قدم رکھو جہاں زندگی کی کشمکش اور قسمت کی نیرنگیوں سے دوزخ کی تکالیف بھی ہیں اور سچے دلوں کی سچی پرستش اور محبت کی دلفریب سحر کاریوں سے فردوس بریں کی لذتیں بھی ہیں - ایسی لذتیں جو زندگی کو رشک ———

میرا ملازم :- (میرا شانہ ہلا کر) حضور! حضور! اُٹھئے! بہت دن چڑھ گیا - رخصتی کے مقدمے والے دیر سے دفتر میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں میں ایک گہری ٹھنڈی سانس لیکر آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا - آنکھیں کھول کر دیکھتا ہوں تو نہ ثریا ہے - نہ وہ خوبصورت نہر نہ وہ سنگ مرمر کے زینے - میں ہوں اور میرا ملازم - اور میرا سونے کا کمرہ - دل میں دیر تک یہ خلش رہی کہ شاید ثریا کو میں اپنی التجا سے راضی کر لیتا - کیونکہ بہت دیر تک مجھے یقین نہ ہوا کہ یہ سب ایک خواب تھا - اور جب یقین ہوا تو دل میں میں نے کہا - .... لاحول ولا قوۃ یہ سب دو بجے رات تک مقدمہ طیار کرنے کا نتیجہ ہے - اب اگر میں یہ عجیب و غریب خواب کسی سے بیان کرونگا تو لوگ اور خاصکر حریت پسند خواتین اور ان کے بعض سرگرم معاونین میرے متعلق قسم قسم کی بدگمانیاں کریں گے - مگر خیر دیکھا جائیگا - خواب ہی تو ہے - خواب پر کسی کو اختیار نہیں ہوتا خاصکر اس وقت جب کہ ایک اہم اور پیچیدہ رخصتی کے مقدمے کے واقعات دماغ کا طواف کر رہے ہوں!!!

اور پھر یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ گو "زاہد نہیں میں شیخ نہیں کچھ ولی نہیں" مگر ارباب حل و عقد کو غور فرمانا چاہئے کہ اتفاق سے اگر یہ خواب کہیں سچا ہی نکل آیا تو مادر ہند کی دختران و فرزندان کا کیا حال ہوگا - اور اس آنے والی لذیذ مصیبت سے ملک کو بچانے کی کیا تدبیر کرنا چاہئے

فیاض علی - بی اے ال ال بی (علیگ)

فلسفۂ مذہب

مذہب کی ابتدا اور ضرورت

اگر انسان اپنے نفس پر غور کرے تو اس کو معلوم ہوگا کہ اس میں بعض ایسے جذبات ہیں جو اس کی فطرت میں داخل ہیں۔ یہ جذبات صرف انسانوں سے مخصوص نہیں بلکہ ان کا عمل تقریباً تمام جاندار پر یکساں ہے مثلاً جذبات شہوانی جن کی وجہ سے ذکور و اناث باہم ایک دوسرے سے رغبت کرتے ہیں یا جذبۂ الفت جو انسان کو اپنے اولاد سے ہوتا ہے موت سے ایک عام نفرت دہراس اور اس سے بچنے کی خواہش یہ ایسے جذبات ہیں جو ہر انسان میں خدا کی طرف سے ودیعت ہوتے ہیں اور جس کے لئے خود اُس نے کوئی تحصیل نہیں کی۔ صانع فطرت کا ان جذبات کو ودیعت کرنے سے صرف ایک ہی مقصود ہے اور وہ یہ ہے کہ نسل انسان کی دنیا میں بقا رہے۔ ان فطری جذبات کو ایک اعتدال پر قائم رکھنے کے لئے۔ تاکہ دنیا میں امن قائم رہے اور نسل انسانی آپس میں کٹ مرکر تباہ نہ ہو جائے ایک دستور نظام کی ضرورت ہوئی۔ اس دستور نظام کو انسان نے خود تخیل کیا یا خدا نے اس کو خاص ذرایع سے تعلیم دیا۔ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب فوراً نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ یہ امر یقینی ہے کہ مثل دوسرے جذبات کے یہ اعتدال انسان کا فطری خاصہ نہیں ہے۔ لہذا اگر مذہب اسی دستور و نظام کا نام ہے تو اس کا علم انسان کو یا تو الہامی ذریعے سے ہوا یا خود اس نے اپنے ہزارہا سال کے تجربہ کے بعد سیکھا۔ بس اول سوال یہ ہے کہ آیا مذہب واقعتاً ایک دستور کا نام ہے۔ جو ہمارے جذبات حیوانی کو ایک اعتدال پر قائم کرائے تاکہ دنیا میں امن کی زندگی بسر ہو سکے۔ اور دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر ایسا ہے تو آیا اس کی تعلیم انسان کو خدا نے بذریعۂ الہام کے دی یا خود اس کی عقل نے ہزاروں سال کے تجربہ کے بعد اُسکی رہنمائی کی۔ یعنی مذہب کی یہ صورت الہامی ہے یا ارتقائی۔

اب اگر ہم دنیا کی مختلف قوموں پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ دنیا میں اب بھی ایسی قومیں آباد ہیں جو اپنی طبعی حالت میں زندگی بسر کر رہی ہیں۔ وہ ان فطری جذبات کو عمل میں لانے کے سوا کسی قسم کے اصول و نظام عمل سے واقف نہیں لیکن باوجود اس بات کے وہ ایک قسم کی مذہبی پابندی رکھتے ہیں اور ایک غیر مفہوم و غیر مرئی یا مفہوم و مرئی شے کے آگے سجدہ کرنا اور قربانی چڑھانا ان کا مسلک ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ان کے اس عمل کو نہ ہم اکتسابی کہہ سکتے ہیں اور نہ الہامی اور نہ فطری اس لئے معلوم ہوا کہ مذہب دراصل کوئی نظام دستور بھی نہیں ہے۔ بلکہ انسان کی ایک عادت مستمر طبیعت ثانیہ ہے جو انسان اپنی فطری جذبات کے ماتحت خود بخود اختیار کر لیتا ہے۔ اب ہم کو دیکھنا ہے کہ انسان اپنی انتہائی وحشت کے حالت میں بھی کیوں اس خاص عادت کا معمول ہو جاتا ہے۔ غالباً انسان کے فطری "جذبۂ خود حفاظت" یا "ہراس موت" نے ایسی حالت میں جبکہ انسان نے اپنے ابنائے جنس کو مرتے ہوئے دیکھا، اس کے دماغ میں مختلف افکار پیدا کئے اور از بسکہ وہ طبعاً خود اپنے لئے ایسی حالت دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ اُس کو سب سے پہلے خیال خود اپنے کو ایسی حالت سے بچانے کے لئے ہوا ہوگا۔ اُس کو اپنی زندگی

کئی بار اپنے سے طاقتور اور خونخوار انسان یا درندوں سے سابقہ پڑا ہوگا اور حالت اضطرار میں جن طریقوں سے اپنی جان کی حفاظت ان کے مقابلے میں کی ہوگی وہ اس قسم کی ہوگی کہ درندوں کی بھوک کو رفع کرنے کے لئے اس نے ان جانوروں یا انسانوں کو جنپر اُس کا قابو ہوتا تھا ان درندوں کی خوراک میں دیکر ان کے حملوں سے بچا ہوگا اور یا حالت انتشار میں عاجزی و خوشامد کو خوفناک حملہ آوروں کے غضب کا بہترین علاج پایا ہوگا۔ بس جو صورتیں بظاہر اس کو ہالک و قاتل افراد کے دفعیہ کے لئے مناسب نظر آئیں وہی صورتیں اُس نے ان جانستان قوتوں کی بھوک مٹانے یا ان کے غصہ کو دور کرنے کے لئے جن کو اگرچہ وہ دیکھتا نہ تھا مگر اتنی سمجھنے کی قدرت رکھتا تھا کہ وہی موت کا سبب ہیں اختیار کرتا تھا۔ یہی جان لینے والی ظاہری یا پوشیدہ قوتیں انسان کی معبود ہوئیں اور ان کے آگے گڑگڑانا۔ سجدہ کرنا۔ ان کو قربانی دینا بلکہ بعض اوقات حالت مایوسی میں مخالفانہ و معاندانہ طریقے مثلاً کاہن و جادوگروں کی امداد سے ان جانستاں قوتوں کے پنجے سے اپنے کو بچانا انسان کا مذہب ہوا اور نتیجہ یہ ہوا کہ انسان نے اپنے خود فطری جذبہ پر اس موت سے اپنے لئے معبود پیدا کئے اور اپنی عبدیت کی وہ عام عادت اختیار کی جس کو ہم عرف میں مذہب کہتے ہیں۔

مگر انسان نے کب نیک و بد میں تمیز کی یا وہ کب اس دستور و نظام کا پابند ہوا جو اس کے جذبات شہوانی کو ایک اعتدال پر لایا یہ امر مسلمہ ہے کہ بے انسان نے کئی دور تک نیک و بد کی تمیز نہیں کی اکثر اس نے خود غرضی سے اور اپنے جذبہ خود حفاظت سے مغلوب ہوکر اپنے سے کمزور انسان بلکہ اپنی اولاد کو قربان کرنے میں دریغ نہ کیا۔ اس کے جذبۂ اشتہا میں۔ Instinct کے لئے اردو میں کوئی مقابل لفظ نہیں پاتا ہوں۔ جو جذبات کا انگریزی زبان میں بہترین مفہوم ہے کم سے کم میرا ذہن منتقل نہیں ہوتا۔ میں نے اس کی جگہ جذبہ جود اگرچہ اپنے اصلی عربی مفہوم سے بالکل غیر موزوں اور بے معنی ہے مگر اردو میں یہ لفظ قریب قریب Instinct کے مفہوم میں سمجھا جاتا ہے۔ اختیار کیا اس سے بہتر لفظ کا علم کسی کو ہو تو وہ اس کی جگہ اس کو سمجھ لیں) نے اُس کو خود اپنے ابنائے جنس کو مارکر کھا جانے پر آمادہ کیا۔ اس کے فطری جذبۂ شہوانیہ نے عورتوں اور مردوں کی مقاربت میں۔ اس میں اور جانوروں میں کوئی تمیز نہ رکھی اور جذبات کی بے اعتدالی سے وہ اصل مقصد یعنی بقائے نسل سے دور جا پڑے اور رفتہ رفتہ مفقود ہوتے گئے۔ اس سوال سے پہلے یا بعد کہ انسان نے کب نیک و بد میں تمیز کی یہ سوال پیدا ہوگا کہ کس نے انسان کو نیک و بد کی تمیز سکھائی۔ قرآن سے تو اس کا جواب بہت جلد دیا جاسکتا ہے۔ "ہدینا النجدین۔ لاتقربا ہذا الشجرۃ فتکونا من الظالمین"۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اس کی جستجو میں ذرا ہم اپنے ہی فلسفہ و تاریخ سے مدد لیں گو کہ آخر میں ہم اسی سرچشمۂ حیات یعنی قرآن عظیم پر آکر ٹھہریں ہی گے تو ہم ان کی تشریح یوں کرسکتے ہیں کہ اگرچہ انسان میں کوئی فطری جذبہ مذہبیت کا نہیں ہے۔ مگر امتداد زمانہ اور ان کے متواتر تجربے نے انسان کو خود بخود مدنی الطبع بنا دیا۔ اور جب ایک زمانے میں وہ اپنے تنہا غاروں اور پتھر کے اوزاروں کو چھوڑکر ایک جماعت کے ساتھ رہنے پر مجبور ہوا تو ایسی جماعت یقیناً ضعیف و قوی افراد پر مشتمل رہی ہوگی۔ بہت عرصے تک تو جماعت کا کمزور فرد باقوت فرد سے مغلوب رہکر اس کی غلامی میں رہا ہوگا۔ اور غلامی کی صورت میں

اسوقت اس کے لئے سب سے بہتر حفاظت جان کے لئے نظر آتی ہوگی تو ایک جماعت میں ایک تعداد غالب افراد کی رہی ہوگی اور ایک مغلوب کی اور آخر میں جماعت کی یہ صورت قرار پائی ہوگی کہ صرف ایک شخص غالب ہوگا اور باقی سب مغلوب۔ اور یہی غالب شخص رئیس طایفہ یا قبیلہ سمجھا گیا ہوگا۔ اس قبیلہ نے کم سے کم اپنی جماعت کے مغلوبین کی حفاظت جان و مال کی ذمہ داری دوسری جماعت کے مقابلے میں کی ہوگی۔ اور اس طرح اس کا وجود ایک حد تک اس نظام و دستور کے لئے جو اس کے جذبات حیوانیہ کو ایک اعتدال پر قائم رکھے پہلی کمزوری ثابت ہوا ہوگا۔ مگر خود رئیس قبیلہ اگرچہ اپنے کمزور ہم جنسوں کیلئے جو اس کی غلامی میں آچکے تھے۔ ان کے درمیان ایک نظام کو قائم کرنے والا تھا۔ اس کا اپنا فعل اپنے غلاموں کے لئے اور خود اپنی طرح دوسرے رئیس قبیلہ کے لئے کسی دستور کا ماتحت نہ تھا۔ وہ اگر چاہتا تو اپنے تمام غلاموں کو قتل کر ڈالتا یا اُن کی عورتوں کو اپنی تصرف میں لے آتا اور اپنے ہمسر کے ساتھ ایک ناتمام ہونے والی جنگ قائم رکھتا۔ غرض جو کچھ وہ چاہتا بے روک ٹوک کر سکتا تھا جب تک خود اس کو نیک و بد کی تمیز نہ ہو اس کی ہستی کمزوروں کے لئے یقیناً ایک خوفناک ہستی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انسان کی اس حالت میں اور پہلی حالت میں تھوڑا ہی فرق رہ جاتا ہے۔ لیکن یہ حالت غالباً بہت دنوں تک قائم نہ رہی ہوگی۔ رئیس کے استبداد و جبر نے غلاموں کی جماعت کو مقاومت پر متفق کر دیا ہوگا اور ایسی صورت میں رئیس قبیلہ اور جماعت غلامان کے درمیان ایک مفاہمت کی بنیاد پڑی ہوگی اور یہی صورتیں دو مختلف جماعتوں اور ہمسر روسا و قبائل میں پیش آئی ہوں گی۔ مفاہمت کی تاسیس اولین ناحق قتل سے احتراز اور حفاظت جان ہوگی اور یہ پہلا امتیاز نیکی و بدی کا تھا اور اس طرح جماعت کے ذریعہ سے کم سے کم انسان کا فطری جذبۂ غضب اعتدال پر آگیا ہوگا۔

اسیطرح انسان کے فطری جذبۂ شہوت نے بہت عرصے تک مرد و عورت کے تعلقات میں سخت انتشار و ابتری پیدا کر رکھی ہوگی اور ازبسکہ مردوں سے عورتیں کمزور واقع ہوئی ہیں۔ مردوں کے تعلقات عورتوں سے تقریباً اسی خود سرانہ طریقے سے رہے ہونگے جیسا باقوت رئیس قبیلہ کا تعلق کمزور غلاموں سے تھا۔ اب لازمی طور سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان نے کس دور میں نکاح کا طریقہ ایجاد کیا اور اس میں اور زنا میں تمیز کی اور پہلے کو ایک فعل مستحسن اور دوسرے کو ایک فعل بد تصور کیا۔ فی زمانا بہت سی وحشی قومیں ایسی ہیں جنہیں شادی، بیاہ کا دستور ہے اور اس کا پتہ لگانا کہ انھوں نے کیونکر نکاح کا طریقہ اختیار کیا۔ ایک مشکل امر ہے شادی اور زنا میں اس قدر فرق ہے کہ شادی میں مرد اس بات کے لئے مجبور ہوتا ہے کہ باہمی مقاربت کا نتیجہ جو اولاد کی صورت میں ظاہر ہو اس کی کفالت کی ذمہ داری میں مرد بھی شریک ہو نہ صرف یہ کہ بلکہ اس حالت میں جبکہ عورت اپنے اس قدرتی بوجھ سے بالکل حالت معذوری میں ہو اور دنیاوی سختیوں کے مقابلے میں بالکل لاچار اور بے بس ہو تو اس حالت میں بھی وہ اسکی کفالت و حفاظت کرے۔ عدم ذمہ داری کا نام زنا ہے۔ پس کس بات نے انسان کو اس ذمہ داری پر مجبور کیا۔ اور کب اور کس دور میں انسان نے نکاح اور زنا میں فرق سمجھا اور ایک کو اچھا اور دوسرے کو برا جانا۔ اب بھی دنیا میں ایسی قومیں آباد ہیں جن کا نکاح در اصل زنا ہے ملیبار و تبت و چند دیگر کوہستانی

ممالک میں ایک عورت کے کئی خاوند ہوتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں کسی ایک مرد پر عورت کے اولاد کی ذمہ داری عائد نہیں ہوسکتی اور یہ صورت قطعی زنا کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ نکاح کو زنا سے بہتر سمجھنا اور نکاح کی طرف مائل ہونا انسان کو اس فطری جذبے نے سکھا یا جو اولاد کی محبت کہلاتی ہے۔ اس جذبۂ الفت نے خود اُسکو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ ان کے ساتھ اس کی ماں کی کفالت کرے۔ جب اُس نے اپنے لخت جگر کو اس کی ماں کے گود میں پایا اور اس کی طرف فطری طور سے کھنچا۔

پس ابتدائی زمانہ میں انسان نے اپنے تجربہ اور ماحول سے جو کچھ حاصل کیا وہ یہ تھا کہ رفتہ رفتہ اس کی خود غرضی (جو انسان کے عمل کی محرک ہوتی ہے) اس کے جذبات فطری کو ایک نظام کے ماتحت اعتدال پر لے آتی اور اس کی افراط و تفریط کو اس نے بدی و نیکی سے تعبیر کیا۔ پس اگر اس کا نام ہم مذہب رکھیں تو مذہب کی تشریح اس کے سوا کچھ نہ ہوگی کہ وہ ایک نظام و دستور ہے جو انسان کے فطری جذبات کو اعتدال پر لے آیا مگر یہ مطلب دنیاوی قانون و سلطنت رانی سے حاصل ہوسکتا ہے۔ جو مذہب کی محض ایک شاخ یعنی شریعت ہے اور مذہب جیسا ہم سمجھتے ہیں اس کی اول کڑی ایمان بالغیب ہے جس پر سارے نظام معاشرت کا دار و مدار ہے۔ (ان کی تشریح ہم بعد کو کریں گے کہ ایمان بالغیب کیونکر ہمارے نظام معاشرت کی کلید ہے) اور ہم نے دیکھا ہے اور قرآن بھی اس کا شاہد ہے کہ وحشی قوموں کو ایمان سے کوئی سروکار نہیں (قالت الاعراب امنا الی آخرہ) اور اس کا علم ان کو کبھی خود بخود حاصل نہیں ہوا۔ اس لئے ہم مجبور ہیں کہ مذہب کی ابتدا کا سر رشتہ ایسی جگہ تلاش کریں جو ہمارے فلسفیانہ اور منطقیانہ حدود سے باہر ہو۔

ایمان بالغیب میں سب سے پہلے انسان نے خدا کو کس طرح پہچانا۔ قرآن نے تو خدا شناسی کو انسانی فطرت بنایا ہے (قرآن سورہ اعراف رکوع ۲۲) اور یہ بالکل صحیح ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ انسان کے فطری جذبہ پر موت نے خود بخود اس کو ایک غیر مفہوم معبود کی طرف مائل کر دیا تھا۔ البتہ انسان کی عقل نے اس معبود کو کیا صورت دی تھی یہیں سے اختلاف مذہب کی صورت پڑتی ہے اور اس حقیقت پر کہ اصل خدا کیا ہے۔ اور اس کی تعداد کیا ہے۔ انسانی عقلوں نے ہر زمانے میں بے شمار اور عجیب و غریب صورتیں پیدا کی ہیں۔ اسلام کے مقابلے میں جس میں توحید کے خیالات سب مذاہب کے مقابلہ میں زیادہ روشن و واضح پائے جاتے ہیں۔ غیر مذہب کے خیالات کا موازنہ یہاں بے محل نہ ہوگا۔

اسلام	غیر مذاہب
(۱) توحید یعنی ایک خدائے برحق پر ایمان لانا جو خالق و معبود کائنات اور ازلی ہے۔ کوئی اسکا شریک نہیں۔	(۱) انسان کی زندگی و موت ہزاروں ارواح کے ہاتھ میں ہے جو دیوتاؤں کے نام سے موسوم ہوتی ہیں
(۲) گو انسانی قوا، خدا کی ماہیت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ لیکن انسان و کائنات کی خود فطرت اس کے وجود پر گواہی دیتی ہے	(۲) یہ ارواح اکثر انسانوں اور جانوروں میں حلول کرتی ہیں اور انسانوں پر ظاہر ہو کر اُن کو اپنا معبود بناتی ہیں
(۳) خدا کی مخلوق اور خدا کے درمیان ذریعۂ پیام خدا کی ایک	(۳) ستارگان و سیارگان آفتاب و ماہتاب کی پرستش

روحانی مخلوق ہیں جو فرشتے کہلاتے ہیں جو خود ہماری طرح خدا کے بندے ہیں اور خدا کی طرف سے جو حکم اُن کو ملتا ہے اس کو بجالاتے ہیں۔

(۴) تثلیث ہنود و کلدانیان و مصریان (یعنی برہما۔ شیو و شنو یا کلدانیوں کے انو۔ بعل و ایا یا مصریوں کے یاباں۔ ری و تاح۔ یعنی آسمان و زمین و ماور ا کے تین علحدہ خالق موت و زندگی و شہرت

(۵) ثنویہ مجوس یعنی نیکی و بدی کے دو مقابل خدا

(۶) کوئی خدا نہیں یا غیر معین و نامشخص خدا یعنی فطرت (مذہب بودھ و ویدانت)

(۷) تثلیث نصاریٰ یعنی باپ بیٹا و روح القدس۔

(۸) الوہم عبرانیان یعنی قومی خدا جو مثل ایک عظیم الشان و قوی ہیکل انسان بادشاہ کے غصہ کرتا ہے آسمانی تخت پر متمکن ہے کام سے تھکتا ہے۔ قربانی کی چربی کی بو سے خوش ہوتا ہے اور اپنی قوم کے مقابلے دوسری قوم کا دشمن ہے۔

اب دیکھو انسانی افکار نے خدا کی آٹھ صورتیں پیدا کیں جن کو درجہ بدرجہ ہم نے اوپر دکھلایا ہے۔ اسفلین خیال انکا اول اور اعلیٰ خیال ان کا آخری خیال تھا۔ لیکن ان سب میں انسان کا اپنی عبدیت کا اقرار موجود ہے۔ جو غالباً ایک فطری جذبہ کے لحاظ سے اس قوت کا لازمی نتیجہ ہے۔ اب ہم قرآن شریف کو کھولیں تو ہم کو حضرت ابراہیم کے قصے میں یہ واقعہ صاف نظر پڑتا ہے کہ حضرت ابراہیم جنکی توحید مسلمانوں کا ارشہ ہے وہ توحید کے خیال پر اپنی فہم و ادراک کی جد و جہد سے پہونچے گویا انسان کے قوائے عقلیہ خود اس کی ایسی رہنمائی کر سکتے ہیں جس کے یہ معنی ہوئے کہ یہ خیال بھی انسان کا ایک اکتسابی اور ارتقائی فعل ہے یا بل چونکہ دور وحشت سے اس زمانے میں بہت دور نکل چکا تھا۔ اور وہاں انسان کا ایسی مدارج ترقی پر پہونچ جانا محال نہ تھا ممکن ہے کہ قوائے عقلیہ نے اس ملک اور اس زمانے میں بہت سے ابراہیم پیدا کرائے ہوں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایں سعادت بزور بازو نیست تا نبخشد خدائے بخشندہ۔ قوائے عقلیہ جو ایسی رہنمائی کر سکیں ہر انسان میں نہیں پائے جاتے اور اس کے ماننے کے لئے کوئی دشواری نہیں کہ دنیا میں بعض نفوس ذکیہ خود خدا سے ایسے خیالات کی ہدایت پاتے ہیں اور ایسے لوگ نبی کہلاتے ہیں۔ اور یہ نبوت دنیا کی ترقی یافتہ انسانوں میں ایک مشترک چیز ہے اور اس نبوت کا وجود مذہب کے لئے لابدی ہے یعنی مذہب کی ابتدا انسانوں میں نبیوں سے ہوئی۔ اُن کے وجود سے پہلے انسان کا کوئی مذہب نہ تھا اور مذہب کی اصل خدا شناسی ہے جو ہر انسان کا اکتسابی فعل نہیں ہے بلکہ وہ جس کو نور خدا ہدایت دے۔ لہذا جب ہم نے دیکھا کہ انسان قوا کے کمالات

ارتقائی طور سے اس کو کامل خداشناسی کی طرف پورے طور سے نہیں لے گئے تو ہم مجبور رہوں گے کہ ہر زمانے اور ملک میں کچھ ایسے لوگوں کے وجود کو تسلیم کریں جن کو فطرت سے وہ قوتیں عطا کیگئی ہیں جو ہر انسان کو دسترس نہیں یعنی ان میں سے ایک شخص برگزیدہ معلم ہوا اور باقی سب متعلم - ان معلمین نے ہم کو ان باتوں سے آگاہ کیا جن تک ہماری عقل کی رسائی ممکن نہ تھی یعنی عالم ارواح کا وجود کائنات کی ابتدا و انتہا - عالم مابعد الموت - موت کی حقیقت - سزا و جزا نیکی و بدی کی کماینبغی تمیز لیکن اس کا کیا ثبوت تھا کہ جو باتیں ایسے لوگوں نے تعلیم کیں وہ در اصل صحیح بھی تھیں - ممکن ہے کہ خود ان کے عجیب و غریب دماغ نے سب اختراع کیا ہو - یعنی یہ سوال ہوتا ہے کہ ان کے دعوائے نبوت کی کیا اصل ہے -

نبوت کی حقیقت سمجھنے کے لئے ہماری سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ سوائے ایک نبی یعنی ہمارے پیغمبر محمد مصطفےٰ صلعم کے کسی نبی کے مفصل حالات ہمارے پاس موجود نہیں ہیں - ان کے پہلے جتنے نبی جس قوم میں سے گزرے ہیں اُن کو افسانہ پرستوں اور معجزہ نگاروں نے ایسا قعر تاریکی میں پھینکا ہے کہ سوائے ان مختصر حوالہ جات کے جو قرآن شریف میں ملتے ہیں کسی اور نبی کا وجود دنیا میں خود ایک سوال بنجاتا ہے لامحالہ ثبوت کی شناخت و صفات پر کلیہ قائم کرنے کے لئے ہمکو وہی نبی منتخب کرنا پڑیگا جس کی مکمل سیرت سے ہم بخوبی واقف ہیں اور وہ صرف پیغمبر آخر الزماں ہیں - لیکن اس سے پہلے کہ ہم اس نبی کے حالات پر نظر ڈالیں ہم کو ایک اور ضروری بات یہاں طے کر لینی چاہئے - دنیا میں بعض ایسے نبی گزرے ہیں جو اپنی قوم کے معلم ہی نہ تھے بلکہ ان پر حکمران تھے اور ایک ہی وقت میں وہ صاحب مذہب و شریعت بھی تھے فجار و کفار کو صرف آخرت سے ڈرانے والے ہی نہ تھے بلکہ انھوں نے ان کو دنیاوی سیاست کا مزہ بھی چکھایا تھا بعض نبی محض معلم تھے بعض محض حاکم اور بعض دونوں کے بین بین اور بعض دونوں میں مشترک پس اگرچہ نبوت کے لئے بعثت اور شرط ہے یہ ضرور نہیں کہ ایک سلطان یا مقننین خدا کی طرف سے مبعوث ہیں ہے - کیونکہ قوانین دنیا یا سلطنت رانی یا سیاست انسان کا ایک ارتقائی در اکتسابی فعل ہے - جس کے منوانے کے لئے جبر کیا جا سکتا ہے اور اسی واسطے گو کہ انسان کے جذبات کا اعتدال پر قائم رکھنا ایک دنیاوی قانون کے ذریعہ سے ایک حد تک ممکن ہے جیسا کہ ہم پہلے دکھلا چکے ہیں اور اسپر بھی مذہب کا اطلاق ہو سکتا ہے کہ وہ تزکیہ نفس کا ایک جزہے مگر در اصل مذہب اسی کا نام ہے جو ایک نبی اپنی الہامی قوت سے تعلیم کرے - اور اسی قوت سے لوگوں کو انپر یقین دلانے میں ساعی ہو - دنیا کا کوئی جبر عقائد کے اوپر نہیں چل سکتا - پھر جب ان خیالات پر یقین رکھا جائے تو ہم خود بخود تزکیۂ نفس کی طرف مائل ہوں گے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک میں نبوت و سلطنت دونوں شامل ہیں یعنی آپ ایک ہی ساتھ سلطان و نبی تھے - مکہ کے زمانے میں انکی حالت تو بالکل ایک نبی کی تھی مگر قیام مدینہ میں وہ صاحب سیاست و جیوش بھی تھے اور ان کے عمل میں اور ایک بادشاہ کے عمل میں کوئی فرق نہ تھا حتےٰ کہ اُنھوں نے اپنے آخری زمانہ میں جبکہ عام طور سے انسان کے قوائے شہویہ کا اضمحلال ہوتا ہے بادشاہوں کی طرح بہ نظر سیاست بعض سربرا وردہ قبائل کی لڑکیوں سے شادی کرنے پر مل نہ ہوئے - ہمارا نظریہ نہ انکی جنگوں پر ہے

اور نہ ان کے تعداد ازدواج پر۔ اور نہ ہم اس کو نبوت کے منافی سمجھتے ہیں اور نہ اس کے لئے شرط۔ مگر از بسکہ ظاہر بیں لوگ ان کے دنیاوی اعمال سے ان کی نبوت پر رائے قائم کرنے کے عادی ہو رہے ہیں اور خصوصاً ان کے تعداد ازدواج کو شہوت رانی کا مشغلہ اور نبوت کے منافی سمجھتے ہیں اسلئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ یہاں پر معترض کا مختصر جواب دیکر ان کے زندگی کے اس دنیاوی پہلو سے صرف نظر کرکے ان کی نبوت کے خصائص کی طرف رجوع ہوں۔

ہمارے معترضین غالباً اس بات کو تسلیم کریں گے کہ انسان کے قوائے شہویہ بذات خود کوئی بری شے نہیں بلکہ وہ انسانی جوہر کا ایک ویسا ہی گرانمایہ عطیہ خداوندی ہے جیسا ذکاوت و بصیرت۔ بلکہ اس قوت کی برتری انسان کو اپنے ہم جنسوں میں ویسا ہی قابل رشک و ممتاز کرتی ہے جیسا اس کی دوسری دماغی اور بدنی قوت۔ جو بات بُری ہے وہ اس کا غلط اور بیجا استعمال ہے۔ پس اگر ہم اس کو فرض بھی کرلیں اور ان لغو حدیثوںؔ کو مان بھی لیں جو شہوت پرست خلفائے عباسیہ کے خاطر وضاعین نے اخذ کی ہیں اور اس طرح ان کے بداعمالیوں کی تاویل کی ہے تو اس سے زیادہ ہم آپ کو مطعون نہیں کرسکتے کہ آپ پچاس سال کے بعد بھی اپنے زمانے کے عام جوانوں سے بڑھکر باقوت تھے اور جو دلیل اس بات کی ہے کہ آپ نے اس قوت کو بھی بیجا صرف نہ کیا تھا۔ پھر ایسا شخص جس میں ابنائے جنس سے ہر چیز میں افضلیت ہو حتی کہ قوت شہوانیہ وہ بجائے مطعون کے بہترین سردار قوم بننے کا حق رکھتا ہے اب صرف سوال یہ باقی رہتا ہے کہ تعداد ازدواج بذات خود معیوب شے ہے یا نہیں۔ ہم اُس کو معیوب اس لئے کہتے ہیں کہ ایک شخص کی پہلی منکوحہ بیوی کے لئے یہ صورت نہایت دلشکن و باعث تکلیف ہوتی ہے اور ایک غریب بیوی جو اپنے خاندان پر جان و دل قربان ہو (جیسا ہمارے ہندوستان کی اوسط طبقہ کی عورتیں عموماً ہوتی ہیں) اس کے صلہ میں مرد نفسانیت سے اپنی بیوی کی اس طرح دلشکنی کرے تو واقعی وہ مرد سوسائٹی کے لئے قابل نفریں ہے۔ اس کے علاوہ کوئی فلسفیانہ منطقیانہ حکیمانہ مورخانہ دلیل تعداد ازدواج کے خلاف نہیں۔ ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ ایسی صورت میں جس کو ہم بیان کر گئے ہیں تعداد ازدواج معیوب ہی نہیں بلکہ حماقت ہے اور ان سے کرنے والے جانوروں کی طرح زندگی کے لطف سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ مگر اس مخصوص صورت کے علاوہ اکثر ایسی صورتیں ہیں جہاں تعداد ازدواج کے بغیر اگر کوئی چارہ ہے تو زناکاری۔ دنیا میں ایک تعداد ایسی نامراد عورتوں کی ہمیشہ رہیگی جن کو کوئی بر نہیں ملسکتا۔ وجہ یہ ہے کہ اول حالت جنگ میں مردوں کی تعداد کم رہا کرتی ہے۔ دوسری حالت میں مردوں کی ایک بڑی تعداد جسمانی و مالی حالت کی وجہ سے شادی سے ہمیشہ معذور رہتی ہے۔ مگر عورتوں کا یہ حال نہیں۔ ایسی صورتوں میں ان عورتوں کی کھپت اگر کسی طرح ہوسکتی ہے تو قحبگی کے رواج سے۔ پس وہ عورتیں جن سے مردوں کی بڑی تعداد مالی و جسمانی معذوریوں کی وجہ سے نکاح نہیں کرسکتی وہ کیوں نہ ایسے مردوں کی باعزت بیویاں بن جائیں جو ان کو نکاح

لہ قال انس کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یدور علی کل ازواجہ فی اللیل الواحدۃ (رواہ المسلم والبخاری)
واقول رحم اللہ علیٰ انس کیف ہو شاہد او من اخبرہ ما وقع بین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و ازواجہ فی اللیل

میں لانے کی مقدرت رکھتے ہیں جبکہ نکاح کا مقصد افزائش و بقائے نسل انسانی پر مبنی ہو۔ اور وہ اس صورت میں بالکل حاصل ہے۔ امراء جو عیش پرستی کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں اور اس واسطے انکی بیویوں میں وہ جان نثاری نہیں پائی جاتی جو طبقہ متوسطین کے ازدواج میں ہوتی ہے۔ ایسے لوگ بجائے ایک برے فعل کے جو بعض ان کو مہلک بیماریوں میں پھنسا کر اُن کو معدوم کر دیتی ہے۔ اگر تعداد ازدواج کو اپنا طریقہ بنائیں تو وہ غالباً سوسائٹی پر ایک احسان کریں گے۔ پس جس مذہب نے تعداد ازدواج کو یکقلم ناجائز قرار دیا ہے خواہ سوسائٹی کی کیسی حالت کیوں نہ ہو وہ حقیقت میں نہایت تنگ خیال اور کم بیں مذہب ہے اور کبھی عالمگیر ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ تعداد ازدواج نہ تو عرب کی سوسائٹی میں قبل اسلام کوئی قبیح امر تھا نہ بیرون عرب بلکہ سوائے رومیوں کے دنیا کی کسی قوم میں معیوب امر نہ تھا۔ اسلام نے بھی تعداد ازدواج کے اصول کو تسلیم کرتے ہوئے ایسی شرائط کی پابندی کے ساتھ اجازت دی ہے کہ اگر نظر انصاف سے دیکھا جائے تو یہی ایک مسئلہ اُن کے احکام کو الہامی ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ مثلاً جمع بین الاختین کے حرام ہونے کی مصلحت سوائے اس کے اور کیا ہوسکتی ہے کہ شائقین تعداد ازدواج کے راہ میں کوئی آسانی نہ پیدا کیجائے۔ ورنہ ہر شخص ایسی صورت میں تعداد ازدواج کا خوگر ہو جاتا اور فریقین کو اس مصیبت میں مشکلات تلاش کرنے سے نجات مل جاتی۔

تو اب آنحضرت پر صرف یہ اعتراض باقی رہ جاتا ہے کہ آپ نے قرآنی حدود ازدواج سے کیوں تجاوز کیا۔ قرآن کو الہامی ماننے والوں کے لئے تو اس اعتراض کی کوئی حقیقت نہیں۔ کیونکہ ازدواج کا محدود کرنا آنحضرت کا فعل نہ تھا بلکہ خدا کا فعل تھا اور خدا نے اس کو اسوقت محدود کیا تھا جب آپ لاعلمی میں عرب کے پرانے رسم کے مطابق آخری نکاح کر چکے تھے۔ جب سورہ نساء میں ازدواج کی تحدید کا حکم نازل ہوا (واضح ہو کہ سورۂ آل عمران و سورۂ بقر کی طرح سورۂ نساء و سورہ مائدہ کی آیتیں ایک ساتھ نازل ہوئیں اس میں ۳ھ سے لیکر ۹ھ تک کے زمانے کی آیتیں ہیں۔ جن کو جامعین قرآن نے ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ تحدید ازدواج کا حکم غالباً فتح مکہ یا اس کے بعد کا حکم ہے) ———— تو آپ کو ان ازدواج کے متعلق جو چار سے زائد تھیں سخت تشویش پیدا ہوئی حتیٰ کہ سورۂ احزاب میں دوسرا حکم نازل ہوا جس میں آپ کی تمام ازدواج آپ پر حلال کی گئیں۔ لیکن آئندہ نہ کسی دوسرے نکاح کی اجازت دی گئی نہ موجودہ ازدواج کے تبدیل کرنے کی۔ مگر جو لوگ قرآن کو الہامی نہیں مانتے ان کے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اگر بالفرض آنحضرت خود اپنے دل سے قرآن بناتے تھے (نعوذ باللہ) تو کم سے کم ایک احمق شخص نہ تھے کہ ایسا چالاک جس نے نعوذ باللہ اس چالاکی سے عرب کو مذہب کا فریب دیکر اپنی سرداری و بادشاہت کا مقصد حاصل کیا) کبھی بھی اپنے پیروؤں کے لئے تعداد ازدواج کو محدود کرنے کا خیال ہی دل میں نہ لاتا جو خود اس کے اپنی تعداد سے کم تھی کہ ایسا کرنا سے اس کا کوئی مقصد و فائدہ نہ ہوتا بلکہ الٹا لوگ اس سے بدظن ہو جاتے۔ ایسا شخص تو اپنے پیروؤں کو اپنے سے زیادہ تعداد میں نکاح کرنے کی اجازت دیتا بلکہ وہ ازدواج کا بہانہ ہی کیوں رکھتا وہ آزادی دیتا کہ ساری دل کی حسرتیں نکل جاتیں علاوہ اس کے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ

خدا جانے معترض کیا سمجھ کر تعداد ازدواج کو نفس رانی کا ذریعہ جانتے ہیں۔ اس سے بڑھکر کوئی نفس کشی اور ریاضت نہیں۔ اپنے گھر کو جہنم بنانا ہو تو دو ہی عورت کرکے دیکھ لو۔ مگر آنحضرت ؐ

زلزلہ

(فسانہ)

مجھے خالدہ سے محبت نہ تھی، عشق نہ تھا لیکن اسی کے ساتھ نفرت بھی نہ تھی، وہ اور میں ساتھ کھیلے تھے ساتھ رہے سہے تھے، اس کے بغیر میرا دل نہ لگتا تھا۔ اور میرے بغیر وہ بے چین رہتی تھی، لیکن خالدہ کے ساتھ شادی کا خیال مجھے کبھی نہ آیا تھا، شاید یہی وجہ تھی کہ جب میری والدہ نے اس کے ساتھ میری شادی کا پیام بھیجا تو مجھے بہت عجیب معلوم ہوا اور کئی روز تک سخت بے چین اور پریشان سا رہا، سچ یہ ہے کہ میں نے اس وقت تک کبھی اپنی شادی کے متعلق غور ہی نہیں کیا تھا، ایک خالدہ ہی نہیں چاہے کسی کے ساتھ میری شادی کا پیام جاتا شاید میری یہی کیفیت ہوتی، اس مسئلہ کے متعلق جب کبھی میں نے اپنے اردگرد نظر ڈالی تو عجیب حال پایا جن کی شادیاں ہو گئی تھیں انھیں ناکتخدا رہنے کی حسرت تھی، اور جو ناکتخدا تھے اُنھیں شادی کرنے کی تمنا،

خالدہ میرے چچا کی اکلوتی لڑکی تھی، چچا کا نام شیخ کلیم نوری تھا، وہ ایک پُرانے خیال کے بزرگ تھے پڑھے لکھے تو معمولی ہی تھے لیکن تیر اندازی اور نیزہ بازی میں اُنھیں یدطولیٰ حاصل تھا، اب بھی صبح کو روز دو گھنٹے کسرت کرتے اور روز شکار کھیلنے جاتے وہ پستول یا بندوق سے شکار نہ کھیلتے بلکہ تیر اور تلوار سے اپنے شکار کو ہدف بناتے، گھوڑے پر کبھی زین کس کر سوار نہ ہوتے روز صبح کو سرد پانی سے نہاتے، یہ تھے ان کے اشغال، میرے چچا مغربی تعلیم اور تہذیب کو اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے وہ کہتے تھے مغربی تعلیم جسمانی اور روحانی دونوں حیثیتوں سے ہمارے جوانوں کو ناکارہ بنا رہی ہے۔

میں انٹرنس پاس کر چکا تھا، ایف، اے میں تعلیم پا رہا تھا، میرے اطوار و خصائل کے سب مداح تھے، میں بھی اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا، جائداد دونوں بھائیوں کے پاس برابر تھی، میں شکل و صورت کا بھی بُرا نہ تھا، لیکن بے حد نحیف و کمزور تھا، آئے دن علیل رہتا کبھی کھانسی اور زکام میں مبتلا کبھی پیٹ کے درد سے بے چین، چچا میرے ساتھ محبت سے پیش آتے مجھے کسرت کرنے اور چست و تندرست رہنے کی ہدایتیں کرتے۔ مجھ سے عدالت کے فیصلوں کا ترجمہ کراتے اور پھر اس ترجمہ کی معرفت میری قابلیت کی سارے محلہ میں تعریفیں کرتے۔

جب میری والدہ نے خالدہ کے لئے پیام بھیجا تو باوجود تمام بے چینی اور گھبراہٹ کے یہ خیال کبھی بھولے سے بھی میرے دل میں نہ آیا تھا کہ چچا مجھے اپنی دامادی میں قبول کرنے سے انکار کر دیں گے۔ اور جب مجھے اس واقعہ کا علم ہوا تو میری حیرت اور پریشانی کی انتہا نہ رہی، میں فطرتاً خوددار واقع ہوا تھا لیکن یہ اس جذبہ پر ایک ایسی کاری ضرب تھی جس سے اثر پذیر ہونا میرے حیطۂ اختیار سے باہر تھا، میں کبھی سوچتا تھا کہ چچا میاں کے برتاؤ کے متعلق مجھے سخت غلط فہمی ہوئی۔ میں اُن کی سیرت کا صحیح اندازہ نہ کر سکا،

کبھی کہتا تھا کہ والدہ نے آخر پیام ہی کیوں بھیجا وہ یقیناً مجھ سے کہیں زیادہ تجربہ کار اور معاملہ فہم ہیں۔ انہیں سمجھ لینا چاہئے تھا کہ اس کا نتیجہ حسب دلخواہ نہ ہوگا۔

میں نے یہ بھی سنا کہ پیام کا جواب دیتے ہوئے چچا میاں کے الفاظ سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ وہ میرے ماموں زاد بھی نعیم ظہری کی طرف مایل ہیں اور شاید خالدہ کی شادی ان کے ساتھ قرار پاچکی ہے، نعیم کا مکان بھی چچا کے مکان سے ملا ہوا تھا، انھوں نے کبھی پڑھنے کی طرف توجہ نہ کیا ہمیشہ اُن کا وقت ادنیٰ طبقہ کے لڑکوں کے ساتھ کشتیاں لڑنے، کبڈی کھیلنے اور مچھلی کا شکار کرنے میں صرف ہوتا تھا جس قدر آبائی جائداد تھی اس کا بڑا حصہ نعیم میاں کے والد اپنی حیات ہی میں برباد کر گئے تھے، جو باقی تھی وہ انھوں نے اور ان کے چھوٹے بھائی نے برباد کردی۔

ان سب باتوں کا ایک دلچسپ نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے خود کو خالدہ کی محبت کے شدید ترین جذبہ میں ڈوبا ہوا پایا میں اب سے پہلے محبت کو بھی کرکٹ اور ٹینس کی طرح ایک کھیل سمجھتا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ جب دل پر اس کا اثر ہوتا ہے تو پھر اور کسی چیز کے لئے گنجائش باقی نہیں رہتی۔ میرا خیال تھا کہ محبت کا جذبہ ایک قسم کی کمزوری ہے لیکن اب اس تجربہ نے بتایا کہ اس خیال میں کم سے کم اتنی ترمیم اور کردینے کی ضرورت ہے کہ اس جذبہ سے نجات حاصل کرنے کی کوشش اس سے کہیں زیادہ بڑی کمزوری ہے، میں جس قدر کوشش کرتا تھا کہ خالدہ کے خیال کو دل سے نکال دوں وہ اور زیادہ شدت کے ساتھ میرے دل پر غلبہ پاتا جاتا تھا۔

خالدہ کی محبت کے جذبہ کا اس طرح یکایک میرے دل میں پیدا ہونا شاید رقابت پر مبنی ہو لیکن میرا خیال یہ ہے کہ اگر محبت پہلے سے موجود نہ ہو تو رقابت کا وجود بھی نہ ہوگا محبت سے رقابت کا پیدا ہونا ممکن ہے رقابت سے محبت کا پیدا ہونا ممکن نہیں اگر یہ خیال صحیح ہے تو مجھے خالدہ سے بھی محبت تھی گو خاموش اور بیگانہ وار سہی،

یا شاید یہ ہو کہ چچا میاں کے انکار نے میری خودداری کے جذبہ کو ٹھیس لگا کر خالدہ کو ایک ممنوع شے قرار دیدیا اور اس کی طرف میری توجہ میں ایک قسم کا استقلال پیدا کر دیا، اگر اس خیال کو صحیح مانا جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ مجھے خالدہ سے زیادہ خود اپنے ساتھ محبت تھی۔

غرض سبب کچھ ہی کیوں نہ ہو یہ ظاہر ہے کہ مجھ پر رقابت کا بھی اثر تھا میرا خودداری کا جذبہ بھی مجروح ہوا تھا اور میری رگ رگ میں خالدہ کی محبت نے اپنا گھر کر لیا تھا،

(۲)

اب مجھے اپنی زندگی قطعاً بے کیف معلوم ہونے لگی، ہر وقت متفکر اور افسردہ خاطر رہتا، یوں تو میں پہلے ہی سے خاموش اور تنہائی پسند تھا، اب یہ کیفیت ہوگئی کہ ہفتوں گھر سے نہ نکلتا، سب سے ملنا جلنا ترک کر دیا، رنج و غم جس طرح بے چین طبیعتوں کو اور زیادہ

بے چین کر دیتا ہے اسی طرح خاموش اور سکون پسند لوگوں کو اور زیادہ خاموش اور سکون پسند بنا دیتا ہے! اسی دوران میں معلوم ہوا کہ خالدہ کی شادی میاں نعیم کے ساتھ عنقریب ہونے والی ہے، اب سے پہلے جو کچھ سنا تھا وہ کوئی فیصلہ کن بات نہ تھی اور اُمید کے ہوائی محل تعمیر کرنے کے لیے کافی سامان موجود تھا، غمگین اور مصیبت زدہ لوگوں کی جان امید ہی ہوتی ہے، حالانکہ اس سے زیادہ با اثر طریقہ پر فریب دینے والی دنیا میں اور کوئی چیز موجود نہیں ہے لیکن اس کے فریب بھی دلربا ہوتے ہیں۔ اور اگر یہ ساتھ دے تو خواہ کسی رنگ میں سہی زندگی دلچسپی کے ساتھ گزر جاتی ہے، اگر امید باقی نہ رہے، تو انسان بہائم سے بدتر ہو جائے۔

میرے لئے اب کوئی اُمید باقی نہ تھی، ہزار طرح کوشش کی مگر دل سے افسردگی کا اثر زائل نہ ہوا، جب اور کسی طرح بس نہ چلا تو بیرونی امداد کی طرف نظر گئی، صبح شام پارک میں ٹہلنے کے لئے گیا، دوست احباب کی طرف رجوع کیا، مختلف کھیلوں کے ذریعہ دل بہلانا چاہا سینما میں آنکھیں پھوڑیں مگر سب بے سود،

اکثر سننے میں آیا تھا کہ شراب رنج و غم کو دور کرنے کا بہترین ذریعہ ہے لیکن اس ذریعہ سے فائدہ اُٹھانا مشکل تھا، کئی مرتبہ خیال گیا لیکن معاملہ خیال کی حدوں سے آگے نہ بڑھا۔ مجھے یوں تو مذہب سے کوئی خاص مناسبت نہ تھی لیکن ماحول اور تربیت کا اثر مجھ پر اس قدر غالب تھا اور سماجی بندشیں کچھ ایسی سخت تھیں کہ اُن کے خلاف ایک قدم بھی چلنا مشکل تھا، لیکن یہاں موت اور حیات کا سوال تھا۔ میرے دل و دماغ کی جو کیفیت تھی اس کیفیت کے برقرار رہتے ہوئے اب میرا کچھ مدت بھی زندہ رہنا ممکن نہ تھا، اگر مذہب کے باقی رہتے ہوئے انسان پر رنج و ملال کی ظلمتیں طاری رہیں تو میرے نزدیک اس کا وہ مذہب مذہب ہی نہیں ہے۔ ہمارے ملک میں آج کل مذہب کے لئے مرجانے کی وبا پھیلی ہوئی ہے! میرے نزدیک مذہب کے لئے زندہ رہنا بہ نسبت مذہب کے لئے مرجانے کے زیادہ ضروری ہے، کم سے کم میں زندہ رہنا چاہتا تھا، مذہب کے لئے نہ سہی اپنے لئے سہی اپنے لئے نہ سہی خالدہ کے لئے سہی،

آخر میں نے فیصلہ کر لیا ۔ کہ مجھے شراب پینی چاہئے، شاید اسی سے غم غلط ہو جائے، شاید میں خالدہ کو بھول جاؤں۔ مگر یہ بھی میں نہ چاہتا تھا، میں تو اس تاریکی کو دور کرنا چاہتا تھا جو میرے حواس پر مسلط ہو گئی تھی، خالدہ سے اگر مجھے محبت تھی تو اس محبت کو میرے دل کے لئے ذریعہ مسرت و شادمانی بن جانا چاہئے تھا، پس میرے موجودہ رنج و ملال کا سبب خالدہ کی محبت نہ تھی بلکہ نعیم کی رقابت اور چچا میاں کے انکار سے اپنی تذلیل کا احساس تھا، ان دونوں چیزوں کا اثر زائل کرنا ضروری تھا اور مجھے پختہ یقین تھا کہ شراب مجھے اس مصیبت سے نجات دلا دیگی اور اگر اپنے مقصد میں مجھے کامیابی نہ بھی ہوئی تو کامیابی کا پریشان کن احساس بھی باقی نہ رہیگا!

(۳)

اب میں سیدھا ہوٹل سیسل پہونچا اور کسی قسم کی عمدہ شراب کے ادھے منگوا کر اپنے سامنے رکھ لئے، اس وقت صرف ایک خیال اپنی پوری قوت اور اثر کے ساتھ میرے دماغ پر مستولی تھا، میری ساری اُمیدیں ان خوش وضع بوتلوں کے طلسم رنگ و بو سے وابستہ

تھیں، ایک نظر فریب خواب میری آنکھوں کے سامنے مجسم موجود تھا اور اس کی صحیح تعبیر مجھے معلوم تھی۔ اس وقت کوئی چیز مانع نہ تھی، مذہب یا سوسائٹی کسی چیز کا بعید ترین اثر بھی میرے دل پر نہ تھا، یہاں تک کہ اس وقت مجھے یہ احساس بھی نہ تھا کہ میں نے اپنے مصائب آلام کے انسداد کا ایک ذریعہ معلوم کر لیا ہے۔ میں ایک گلاس بھر کر بلا توقف اور بغیر دم توڑے چڑھا گیا۔ میں نے سوائے ذائقہ خراب ہو جانے اور کوئی خاص اثر محسوس نہ کیا، مجھے توقع تھی کہ حلق سے اترنے کے بعد پہلا ہی سیکنڈ کسی دوسرے عالم میں گزرے گا؛ خلاف امید ایسا نہ ہو دوسرا گلاس پیا اب اثر ہوا اور تشفی بخش ہوا ایسا معلوم ہونے لگا کہ گلے کے راستہ سے روشن مشعلوں کا ایک جلوس آہستہ آہستہ گزر رہا ہے تیسرا گلاس گو سیال آتشین مادہ کے مانند سہی مگر تھا پُر کیف اُس نے مشعلوں کے جلوس کو اور زیادہ تیز کر دیا اور اس کی رفتار بہت خوشگوار معلوم ہونے لگی، چوتھا گلاس .... اب کسی نے سر کے اندر آتش بازی چھوڑنی شروع کر دی اب میری حالت پہلے سے بہتر تھی۔ نہ صرف روحانی حیثیت سے بلکہ جسمانی حیثیت سے بھی میں اپنی نظر میں خود کو قوی تر محسوس کرنے لگا اور گویا خالدہ کی جدائی کی ساری اہمیت زائل ہونے لگی، مجھے خیال ہے کہ چوتھے گلاس کے بعد میں نے ہوٹل کے پیش خدمت سے کہا تھا کہ "دنیا میں خالدہ ہی سب کچھ نہیں ہے"۔

میں نے دیکھا کہ اس دوران میں ہوٹل کے اندر اور بھی چند آدمی آ گئے تھے، ان پر ایک نظر ڈالتے ہی مجھے سب سے محبت ہو گئی میں نے خدمتگار کو "پیارے ساقی" کہکر مخاطب کیا اور اُسے حکم دیا کہ ان سب کو جس قسم کی شراب یہ چاہیں اور جس قدر چاہیں پلانی شروع کر دے اور پھر ایک میز پر کھڑے ہو کر میں نے سب کو مخاطب کیا، مجھے یاد ہے کہ میز پر میں اس لئے کھڑا ہوا تھا کہ میری آواز سب اچھی طرح سن لیں، میں نے کہا "میرے دوستو! میں جانتا ہوں کہ تمھیں خالدہ سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور نہ تم میرے جاہل چچا سے ہمدردی رکھتے ہو، تم بھی میری طرح یہاں غم غلط کرنے آئے ہو، پس تم سب میرے مہمان ہو، تم میرے ہمراہ چلو ابھی اسی وقت چلو اور جب تک تم چاہو میرے مہمان رہو، تم سب میرے بھائی ہو" اور خاص طور پر تم، یہ آخری فقرہ میں نے ان میں سے اس شخص کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا جو ان سب میں زیادہ کمسن اور خوشرو تھا،

میں اس وقت بھی جب ذرا سکون کے ساتھ حافظہ پر زور ڈال کر یاد کرتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ اس خوشرو جوان نے میرا شکریہ ادا کیا تھا لیکن خدا جانے اس وقت میں نے کیا سمجھا، جب وہ میری گفتگو کے بعد اپنا جواب پورا کر چکا تو میں نے اس سے پوچھا کہ "تو نے کیا کہا"؟ مجھے خیال ہے کہ اس نے پھر شکریہ ادا کیا لیکن میری سمجھ میں پھر خدا جانے کیا آیا کہ میں نے سب کو گواہ بنا کر کہا کہ "حضرات آپ نے دیکھا کہ میری اس شخص کے ہاتوں بہت تذلیل ہوئی ہے جس نے ابھی میری تذلیل کی ہے، میں جھگڑے فساد سے ہمیشہ الگ رہتا ہوں۔ لیکن اگر کوئی شخص خواہ مخواہ اس کا طالب ہو تو پھر میں چوکتا بھی نہیں، وہ میرا جاہل چچا سمجھتا ہے کہ مجھ میں زور اور قوت نہیں ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کمسن جوان کو اسی نے بہکا کر بھیجا ہے، میری قوت کا اندازہ ابھی ہوا جاتا ہے، دیکھئے ابھی ہوا جاتا ہے، جس کا جی چاہے دیکھ لے۔

یہ کہکر میں نے میز پر کھڑے ہی کھڑے کوٹ اتارا اور قمیص کی آستینیں چڑھائیں اور جیسے شہباز اپنے شکار پر حملہ آور ہوتا ہے ایک جست میں اس خوشرو جوان کی گردن پر آ پڑا، کسی نے سچ کہا ہے نفرت محبت کی ہمسایہ ہے اصل میں اسی جوان کی طرف میں سب سے زیادہ مایل ہوا تھا اور اسی سے سب سے پہلے متنفر ہوا، شراب نے میرے حواس میں بجلی کا اثر پیدا کر دیا تھا، معمولی حالت میں یہی کیفیت شاید چند روز کے اختلاط کے بعد رونما ہوتی اب ساری منزلیں چند منٹ ہی میں طے ہو گئیں۔ مجھے ایک ہلچل اور ہنگامے کا خیال تو ہے لیکن اسکے علاوہ اور کچھ یاد نہیں، اس کے بعد جو بات مجھے یاد ہے وہ یہ ہے کہ میں نے خود کو رات کے وقت بڑے بازار کی ایک بند دوکان کے پتھر پر بیٹھا ہوا پایا۔ اس ہیئت میں کہ نہ سر پر ٹوپی تھی اور نہ پانوں میں جوتا، ظاہر ہے کہ میں ہوش میں نہ تھا لیکن اسی کے ساتھ مجھے اس امر کا بھی اچھی طرح احساس تھا کہ میں ہوش میں ہوں، مجھے معلوم تھا کہ میں بھرے بازار میں ننگے سر اور ننگے پانوں ایک مکان کے پتھر پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہوں اور یہ بھی سمجھتا تھا کہ اگر میرے حواس بجا ہوتے تو یہ حرکت مجھ سے کبھی سرزد نہ ہوتی لیکن اس وقت مجھے اس کی قطعاً پروا نہ تھی بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ یہ رنگ بھی مجھے مرغوب تھا۔

سڑک کے دوسرے کنارے ایک نان بائی کی دکان تھی جس نے زمانہ کا ساتھ دینے کی کوشش میں اپنی دکان کے اندر جو وہ تین معمولی دکانوں کو ملا کر بڑھائی گئی تھی ایک بڑی سی میز بچھا رکھی تھی اور اس میز کے اردگرد بہت سی کرسیاں ڈال دی تھیں، میں نے دیکھا کہ اس دکان میں پانچ چھ آدمیوں کی ایک قطار داخل ہوئی مگر یہ سب عجیب و غریب قطع کے انسان تھے، پہلا شخص کسی طرح ڈھائی فٹ سے زیادہ نہ تھا دوسرا اس سے بھی کم قد تھا، تیسرا اور چوتھا بھی اسی سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ لیکن پانچواں قد کے لحاظ سے ان سب سے بازی لے گیا وہ کسی طرح ڈیڑھ فٹ سے زیادہ نہ تھا، ذرا غور کرنے سے مجھ پر واضح ہو گیا کہ یہ سب بادۂ ناب کی بوالعجبیوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے لیکن اس علم کے باوجود بھی ان لوگوں کے قدوں میں کوئی اضافہ نہ ہوا۔

اب مجھے اس امر کا نہایت بے چینی کے ساتھ احساس شروع ہو گیا کہ میرا دماغ قطعاً بیکار ہو گیا تھا، میری ٹانگوں کا آزادانہ اور میری مرضی کے خلاف عمل کرنا اب میرے لئے زیادہ اہم نہ تھا، میرے سر میں یہ کیفیت پیدا ہو جاتا کہ گویا اس کے اندر شہد کی مکھیوں نے اپنا چھتہ بنا لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تکلیف وہ سہی لیکن قابل برداشت ضرور تھا لیکن اس امر کا احساس کہ میرا دماغ اپنے فرائض انجام دینے سے قاصر ہے میرے لئے قیامت تھا، مجھے اگر کبھی کسی چیز پر فخر ہوا ہے تو وہ میرے دماغ کی غیر معمولی خوبی تھی۔ لیکن میری حرکتوں نے آج اس کا بھی خاتمہ کر دیا۔

(۴)

خدا جانے میں کس طرح گھر پہنچ گیا، میرے نزدیک اب میرا نشہ کم ہو گیا تھا، اس لفظ کا خیال آتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے ایک میل کے فاصلہ سے نہایت آہستہ آہستہ دس منٹ میں اس لفظ کو ادا کیا ہے، میں کوٹ اتار کر سیدھا اپنے بستر میں جا لیٹا۔ لیکن نیند کا

پتہ نہ تھا اول تو شیندیوں بھی اپنے طلب گاروں سے گھبراتی ہے لیکن میری تو حالت ہی غیر تھی، چھت کی طرف نظر گئی تو عجیب کیفیت پیش نظر تھی ایسا معلوم ہوا کہ چھت کا ایک حصہ مع کمرے کی جنوبی دیوار کے بڑے دھماکے ساتھ زمین پر آ رہا، میں دیر تک آنکھیں پھاڑے ہوئے تکتا رہا، میں جانتا تھا کہ اصل میں کچھ نہیں ہے، یہ سب محض میری نظر اور میرے دماغ کا فتور ہے معلوم ہوتا تھا کہ میری ساری قوتیں زائل ہو چکی ہیں، مگر تعجب یہ ہے کہ اس قدر کمال کے ساتھ میری نظر مجھے دھوکا دیتی تھی کہ اگر میں اپنی اصلی حالت سے آگاہ نہ ہوتا تو میں بلاخوف تردید کہہ سکتا تھا کہ کم و بیش پانچ فٹ چھت یکا یک غائب ہو گئی، صاف آسمان نظر آنے لگا، یہاں تک کہ زمین پر تختوں کڑیوں اور مٹی کا ڈھیر بھی موجود تھا اور صرف یہی نہیں کہ میری آنکھوں ہی نے مجھے دھوکا دیا ہو بلکہ میرے کانوں نے بھی انکا ساتھ دیا میرے کانوں میں کتنی ہی دیر تک برابر شور و غل کی صدائیں آتی رہیں اور برآمدہ میں مشرق کی طرف والی سڑک پر لوگوں کے بھاگنے اور تیز تیز چلنے کی آوازیں میں متواتر سن رہا تھا۔

میں بستر سے اٹھا، اینٹ اور مٹی کے ڈھیر کے پاس گیا، اسے ہاتھ سے چھو کر دیکھا، اب میں نے اندازہ کیا کہ میری قوت لامسہ بھی جواب دے چکی ہے، وہ اینٹ اور مٹی کا ڈھیر گو محض میرے دماغی توازن قائم نہ رہنے کا ایک نتیجہ تھا لیکن اسے مس کر کے دیکھا تو مجھے اسی طرح ٹھوس معلوم ہوا جیسے واقعی مٹی کا ڈھیر ہونے کی صورت میں معلوم ہوتا۔

میں پھر بستر پر جا لیٹا! سخت فکر اور پریشانی میں مبتلا تھا ایک ہی لغزش نے پانسہ پلٹ دیا، کیا سوچا تھا کیا ہو گیا، دماغ بیکار ہو گیا، نظر میں فرق آ گیا، سماعت اپنی اصلی حالت پر باقی نہ رہی، قوت لامسہ پر اطمینان نہ رہا، اسی ہجوم افکار و آلام میں مجھ پر غفلت طاری ہو گئی اور پھر نیند آ گئی۔

میں صبح کو پہر دن چڑھے بیدار ہوا، میرے سر میں سخت درد تھا، سارا بدن چور چور تھا، رگ رگ میں درد معلوم ہوتا تھا لیکن بفضل خدا میری نظر اور سماعت اپنی اصلی حالت پر برقرار تھیں،

سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ رات جو کچھ میں نے دیکھا تھا وہ محض میرے دماغ اور نظر کا فتور نہ تھا، اب سے آٹھ دس گھنٹے پہلے جہاں جہاں ایک بلند دیوار موجود تھی وہاں اب کھلا ہوا میدان تھا، اور دھوپ کی تیزی بلا روک ٹوک مجھ تک پہنچ رہی تھی، آدھی سے زیادہ چھت بھی زمین پر تھی، مجھے رہ رہ کر تعجب ہوتا تھا کہ معاملہ کیا ہے، اسی دوران میں چچا میاں تشریف لے آئے، وہ کچھ گھبرائے ہوئے تھے آتے ہی بولے "ہائیں طلعت! کیا رات تم کمرے سے نکلے بھی نہیں؟"

میں:- "جی نہیں، کیوں کیا کوئی خاص بات تھی؟"

چچا:- "زلزلہ سے زیادہ اور کیا خاص بات ہوتی"۔

میں:- "کیسا زلزلہ؟"

چچا :- "اُسی رات والا قیامت خیز زلزلہ"۔

میں :- اچھا وہ رات والا زلزلہ، جی ہاں میں تو وہیں رہا، دیوار اور چھت گرنے کے بعد تو سوچا تھا کہ مکان سے باہر چلا جاؤں مگر پھر میں نے کہا ایسا ہی زلزلہ ہے کیا گھبرانا ہے، انسان میں کچھ تو ہمت چاہئے، پھر وہ سامنے والی دیوار گر گئی، میں نے کہا چلو خیر اسے بھی گر جانے دو۔ زلزلہ بیشک زور دار معلوم ہوتا تھا اور بس پھر اس کے بعد میں سو گیا"۔

چچا میاں کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں بولے "واللہ! میں تمہیں اس قدر نڈر با ہمت اور شجاع نہیں سمجھتا تھا بیٹا تم تو فخر خاندان ہو، دلیر اور بہادر لوگوں کی خدا بھی مدد کرتا ہے، میاں نعیم کو دیکھو پہلے ہی جھٹکے میں چیخ مار کر بھاگ گئے میں نے بہتیرا بلایا ذرا بچوں کو باہر لیجانے میں مدد ملجاتی مگر اس بندۂ خدا نے منہ پھیر کر بھی نہ دیکھا، آؤ ذرا تم اپنی چچی کے پاس تو آؤ"

میری ہمت اور شجاعت کے اس زبردست ثبوت کے بعد شاید یہ امر کچھ تعجب انگیز نہ تھا کہ اُسی ہفتہ کے اندر خالدہ سے میری شادی ہوگئی۔

حامد اللہ افسر

خصوصیات ملاحظہ کیجیے — نمونہ ایک ماہ منگالیجئے

ایک روپیہ میں آٹھ سو صفحے

(سائز ۲۰×۱۸×۲۲ کاغذ سفید عمدہ قسم، طباعت نفیس، کتابت درست، انتخاب ممتاز قلم جسکو باہر منگائیے مگر فرمائش عدد سے کم نہ ہو)

بہرام کی آزادی صہ ۲۱۲	کرشمۂ رقابت صہ ۱۴۰	ابر رحمت صہ ۳۲	چلبیلا ناول صہ ۱۲۲
نانا صاحب کی لوٹ صہ ۱۶۸	شوقین جاسوس صہ ۱۲۶	اندھیر نگری صہ ۳۶	شریفہ بی بی صہ ۱۲۰
وفادار دلہن صہ ۱۰۰	مالوہ کی بیگم صہ ۵۶	ایرانی خاتون صہ ۴۰	رشاد و رشیدہ ناول [illegible]
شگوفۂ محبت صہ ۱۰۲	دلہن کی چوری صہ ۵۶	دیوان چرکیں صہ ۳۶	[illegible] صہ ۴۳
زر پرست صہ ۱۴۰	ہوس انتقام صہ ۱۰۰	ترکی حرم سرا صہ ۴۰	محروم وصال صہ ۱۲۲
بلائے بد صہ ۱۵۲	وفادار لڑکی صہ ۵۲	جنگ قفقاز صہ ۱۰۰	منیر و گوہر صہ ۱۲۰
محب وطن صہ ۹۲	بیمار عاشق صہ ۷۶	میاں پوت صہ ۶۸	وصل جمیل صہ ۴۴
خونی ساحر صہ ۱۲۴	بوالہوس بنگالی صہ ۵۲	لال جوہری صہ ۶۸	اسیر گیسو صہ ۱۲۴
حسین قزاق صہ ۹۶	ممتاز بیگم قتل باولہ صہ ۵۲	انقلاب فرانس صہ ۱۹۶	خون عاشق صہ ۹۰
کنجی کا راز صہ ۱۱۲	بڈھا دولہا ننھی دلہن صہ ۴۴	سپاہی کی دلہن صہ ۱۴۸	انوکھی جوگن صہ ۸۸
شریف چور صہ ۱۰۸	حسن بنارس یا خفیہ عیاشی کا راز صہ ۱۶۸	محبوبہ لندن صہ ۲۲۸	اٹھتی جوانی صہ ۹۲
گوہر بانو صہ ۴۸	دربار حرام پور صہ ۵۲	خوبیٔ قسمت صہ ۹۲	تیز دار دلہن صہ ۴۴
عیارہ جمیلہ صہ ۴۰	حسین رانی صہ ۵۲	کرشمۂ الفت صہ ۷۲	لاڈلا بیٹا صہ ۴۴
۲۰ برس کا دغاباز صہ ۸۸	پستول باز معشوقہ صہ ۴۰	جلاد پدر صہ ۱۲۶	نئی دلہن صہ ۵۱
ننگ خاندان صہ ۹۶	سگھڑ سہیلی صہ ۳۶	خونی منظر صہ ۹۲	تکیلی بیگم صہ ۵۰
مراکش کا خونی ڈاکو صہ ۶۰	ہنسی کا پٹارہ صہ ۵۲	سچی الفت صہ ۶۸	خار غم صہ ۵۲
حسن عیار صہ ۶۰	بچھڑوں کا ملاپ صہ ۵۲	ایران کی شہزادی صہ ۷۶	دیوان جان صاحب صہ ۱۰۰

المشتہر منیجر مفید عام بک ڈپو لکھنؤ (انڈیا)

میری ڈائری کا ایک ورق

(بسلسلۂ ماسبق)

"رخ تماشہ گہہ ناز آورم" ——————

میں پھر اسی بلدۂ شعر و موسیقی کی طرف جا رہا ہوں، جہاں اب سے پانچ سال قبل، صحیح معنی میں اس ایک نگاہ کو دیکھا تھا، "جو بظاہر نگاہ سے کم تھی" ——— طبیعیات میں نگاہ، ایتھر کا اہتزاز و تموج ہو یا اس کا انعکاس، لیکن مجھ سے پوچھئے تو میں کہونگا کہ وہ صرف کیفیت ہے روح کی، پیام ہے قلب کا، کبھی فرمان کی صورت میں اور کبھی التجا کے رنگ میں ——— غالب نے انتہائی نزاکت خیال سے کام کیا کہ ریاضی کے ماتحت اس کو "نیم" یا "ربع" میں تقسیم نہیں کیا، بلکہ "بظاہر" کہکر گویا یہ بھی بتا دیا کہ ممکن ہے وہ بہ لحاظ ادائے حسن و لطف کیف پوری "نگاہ" ہو اور ہم اندازۂ شوق اسے "کم" سمجھتے ہوں ——— بہر حال سواد بمبئی شروع ہوتے ہی ایک ایک کر کے تمام ان کیفیات کی یاد ستانے لگی، جن کو ہر چند میں بھلا تو چکا ہوں، لیکن اس بھلانے کی ایذا کبھی نہیں بھول سکتی:-

جاتی ہے کشمکش کوئی اندوہِ عشق کی　　گر دل نہیں رہا تو وہی دل کا درد تھا

ایک شام کا واقعہ ہے:-

ساحل آب پر خاموش تنہا بیٹھا ہوا قدرت کی اس عظمت و جبروت کا مطالعہ کر رہا ہوں جس کا نام سمندر ہے ——— حد نظر تک سوائے اس ایک ہیجان و سیال کے اور کچھ نہ دکھائی دیتا، شب و روز لاکھوں کروڑوں سال سے اسی طرح اس کا متلاطم رہنا ——— ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فطرت اپنے آپ کو زمان و مکان سے آزاد کرنے کے لئے سخت اضطراری طور پر بیتاب ہے ——— میں دیر تک اس متشکل "لانہایت" اس مرئی "ابدیت" پر غور کرتا رہا اور پھر کائنات کی اس بسیط فضا کا خیال کر کے جس میں ہمارا سارا نظام شمسی ایک جگنو سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، حقیر ترین کرۂ زمین کی طرف ذہن منتقل ہوا اور پھر اس کی ارب در ارب آبادی میں اپنی ہستی پر غور کیا تو بے اختیار ہنسی آگئی جس طرح خردبینی جراثیم ہمارے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے، اس سے زیادہ بے حقیقت ہستی نوع انسان کی فطرت کی نگاہ میں ہے، پھر اس کے لئے حشر و نشر کا اہتمام عذاب ثواب کا طومار، بہشت و دوزخ کا قصہ، آخر کیوں؟ - یہ سب مفروضات ہیں جن کے ذریعہ سے انسان اپنی ہستی کو متعین کرنا چاہتا ہے، حالانکہ عمان بسیط کو یہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ اس کی رو میں کتنے خس و خاشاک بہکر کہاں چلے جاتے ہیں ——— بیدل اپنے مخصوص انداز میں اسی خیال کو اس طرح ظاہر کرتا ہے۔

چو حباب غیر لباس تو چہ توقع و چہ ہراس تو نہ تو مانی و نہ تیاس تو چو کشند جامہ زپیکرت

حباب جو اپنی ہستی کے لحاظ سے صرف ایک لباس ہے، اس کو توقع یا ہراس سے کیا واسطہ جس وقت لباس اتر گیا قصہ ختم ہو گیا نہ جامہ رہا نہ کوئی پیکر ——

چاند افق سے بلند ہو چکا تھا اور اس کی زرد شعاعوں کا حزن و ملال فضا میں ایک سوگوارانہ کیفیت پیدا کرتا جا رہا تھا —— آج اُس کا چہرہ مجھے بہت غم آلود نظر آتا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی سامنے رو تو رہا ہو لیکن سر نہ اٹھائے —— سمندر میں اُس کا انعکاس ڈبڈبائی ہوئی آنکھ کی کیفیت پیدا کر رہا تھا —— رات بھیگی ہوئی تھی۔ لیکن اس کا نم ایسا ہی محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی نہا کر بال خشک کرنے کے بعد بازو پر سر رکھ کر لیٹ جائے دور چوپاٹی کے ساحل پر برقی فانوسوں کی پُر خم قطار ایسی نظر آ رہی تھی جیسے کسی گلے کا ہار، اور چونکہ وہاں کا ہنگامہ میری نگاہ و سماعت سے بہت دور تھا اس لئے یہ سارا منظر ایک ایثری (Ethereal) کیفیت رکھتا تھا —— میں ساحل پر لیٹ گیا اور دیر تک غور کرتا رہا کہ اس وسیع کائنات میں میرا وجود بھی وہی حکم رکھتا ہے جیسے ریگستان میں کسی کا نقش قدم کہ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا اس کے لئے پیام فنا ہے۔

ستارے جھلملا رہے تھے اور ان کی روشنی کا قبض و بسط حالی کے بیان کردہ مفہوم کے مطابق گویا غالب کے اس مصرع کی تکرار کر رہا تھا۔

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق

میں بھی سمجھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ ”ہاں، کون ہوتا ہے؟“ —— ”کس میں اتنی تاب ہے“ —— کہ دفعتہ قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی اور اسی کے ساتھ ایک ایسی کراہ کے ساتھ جس میں روح کا انتہائی حزن و ملال پنہاں تھا گویا کسی نے یہ کہا:۔

”کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد“

میں اُٹھ کر اس طرف متوجہ ہونا ہی چاہتا تھا کہ کوئی ساحل سے پانی میں تھا اور تھوڑی دیر کے بعد موج کی اس آغوش میں جس کا ہلکا سا فشار بھی ہمیشہ کے لئے بے خبری کی نیند سلا دیتا ہے۔ صبح کو سمندر کی دیوی نے اس نازنین کی روح کی قربانی قبول کر کے اس کے جسم کو پھر ساحل پر لا کر ڈال دیا جستجو سے سوائے اُس ایک کاغذ کے بنڈل کے جس میں ایک ہار، ایک رومال اور ایک خط تھا۔ اور جس کو وہ ساحل ہی پر چھوڑ گئی تھی نہ کوئی اور چیز ملی نہ یہ پتہ چلا کہ وہ کون تھی اور کس کی داغدار —— خط کا مضمون یہ تھا:۔

”اب تو خوش ہو بیوفا تیرا ہی لے کہنا کیا“

”تمھاری محبت طوفان کی طرح آئی اور میرا سب کچھ اپنے ساتھ لے گئی، ہائے وہ بھی کیا عالم نامرادی تھا۔ کہ تمھاری محبت کی تمام لذتیں میرے لئے مخصوص تھیں اور میں ان کے اعتراف سے بھی عاجز تھی۔ ایک زمانہ گزر گیا۔ یہ میری زندگی کا وہ عہد تھا جسے میں نے ہمیشہ دورِ شراب سمجھا، یہاں تک کہ ہر نشہ کی طرح اس میں بھی زوال آ گیا، اس لئے نہیں کہ میں نے اُسے رد کیا بلکہ اس وجہ سے

کہ تمھارے جرعہ ہائے الفت اب میرے لئے مخصوص نہ تھے۔ پھر جس طرح وہ شراب آہستہ آہستہ "رسا" ہوئی تھی، اسی طرح رفتہ رفتہ وہ ایک "آب ناصاف" کی صورت اختیار کرنے لگی، یہاں تک کہ یہ "چشمۂ حیات" میرے لئے بالکل خشک ہوگیا اور تم باوجود میری انتہائی التجاؤں کے میری روح کی اس تشنگی کو بجھانے کے لئے آمادہ نہ ہوئے اور آخر کار نوبت یہاں تک پہونچی کہ تمھارے بت کے سامنے میری آنکھوں نے دل کا آخری قطرہ تک پیش کر دیا، لیکن تمھارا وہ قاتل و خونین تبسم، جس کو میں نے پہلے صرف تبسم بہار سمجھا تھا، اب بھی بدستور قائم تھا — آخر آخر میری صرف یہی ایک التجا تم سے رہگئی تھی کہ خدا کے لئے تم مسکرانا چھوڑ دو —

میں درد و غم سے بیتاب اور تم متبسم! میں تمھاری بیوفائیوں اور بیدردیوں کی داستان سے لبریز اور تم متبسم! میں تڑپ رہی ہوں تم مسکرا رہے ہو، میں رو رہی ہوں تم مسکرا رہے ہو یا اللہ، یہ کیا قیامت ہے! — میں نے بارہا کہا کہ تم کو پاس وفا نہیں نہ ہو، تم مجھ سے بیزار ہوگئے ہو، مجھے گوارا، تم میری محبت کو ٹھکرانا چاہتے ہو، مجھے منظور، لیکن میں یہ کیونکر برداشت کر سکتی تھی کہ تم اپنے تبسم سے مجھے جھٹلاؤ، اپنی بے پروائی سے مجھے جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرو ————

گزشتہ چھ ماہ کی زندگی میں تمھاری محبت کے عروج و انحطاط کے جو منازل مجھ پر گزر چکے ہیں وہ ایسے معمولی نہیں کہ مجھے زندگی و موت میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے پر مجبور نہ کرتے — پھر جب میں نے دیکھا کہ ایک وقت انسان پر ایسا بھی آسکتا ہے جو زندگی کو موت سے بدتر سمجھنے لگے تو چارۂ کار سوائے اس کے نہ تھا کہ میں موت کو ترجیح دیتی کیونکہ کم از کم وہاں پہونچکر مجھے تمھاری مسکراہٹ کے دیکھنے کا اندیشہ تو نہ تھا جس کی بوئے خون مجھے ہمیشہ لرزہ براندام کر دیتی تھی۔

تمھاری محبت کے اولین ہدایا جنھیں عزیز رکھنے کی کوشش میں آخر کار مجھے جان دینا بھی گوارا کرنا پڑا اسی دنیا میں چھوڑے جاتی ہوں جہاں ایک زمانہ تک انھوں نے مجھے تڑپائے رکھا ———— یہ ہار جسے میرے دل کی دھڑکن نے خدا معلوم کس کس طرح بیقرار رکھا اور یہ ~~رومال~~ جس میں، اللہ ہی بہتر جانتا ہے، کہ میرے کتنے آنسو جذب ہو چکے ہیں، چھوڑے جاتی ہوں اس لئے نہیں کہ آپ انہیں میری یادگار سمجھکر محفوظ رکھ لیں، بلکہ صرف اس غرض سے کہ جب آپ انھیں دیکھیں تو ایک مرتبہ پھر مسکرا دیں —

خدا کرے میری موت کی پہلی رات آپ کی حیات نشاط کا اولین نوروز ہو —

بدنصیب

ز — خ

.... یہ واقعہ بھی منجملہ اور بہت سے واقعات کے ہے جو میری سابق سیاحت بمبئی کو ہمیشہ تازہ رکھیں گے ......

گاڑی جسوقت اسٹیشن پر پہونچی تو افضال پلیٹ فارم پر موجود تھا۔ میں اترا اور دیر تک اسے حیرت سے دیکھتا رہا ——— میرے تصور نے جو خیالی تصویر اس کی قائم کی تھی وہ یقیناً بہت مختلف تھی، میں سمجھتا تھا کہ وہ بھی میری ہی طرح ایک افسردہ چہرہ، ایک مضمحل صورت رکھتا ہوگا اور زمانہ کے تلخ تجربات نے اس کے خد و خال پر بھی کافی نقوش چھوڑے ہوں گے لیکن وہ ہنوز دیعان شباب کی تصویر تھا، جوانی کی شگفتگی اس کے خد و خال سے ظاہر ہو رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ میری ناکام زندگی کا انتقام دنیا کے ذرہ ذرہ سے لے رہا ہے

میں اس وقت سراپا استفہام تھا اور چاہتا تھا کہ وہ اپنی گزشتہ دس سال کی زندگی کا افسانہ بیک وقت مجھے سنا دے، لیکن میں حیران تھا کہ کہاں سے سوال کی ابتدا کروں، وہ یہ سب کچھ سمجھ رہا تھا اور صرف مسکرا رہا تھا ـــ آخرکار میں نے گھبرا کر ایک مرتبہ یہ سوال کر ہی دیا کہ :-

"افضال خدا کے لئے بتاؤ تم کیا ہو، کون ہو، کہاں ہو" وہ یہ سنکر ایک ایسے قہقہہ کے ساتھ جیسے شراب کا نشہ ملا ہوتا ہے ہنسا اور بولا "آزاد ہوں، انسان ہوں، اور وہاں ہوں جہاں ہر شخص کی رسائی ناممکن ہے"

——— "خدا کے لئے عملی دنیا اور مادی عالم کی باتیں کرو۔ تمھارے معمے کسی وقت فرصت سے بیٹھکر حل کرونگا، اس وقت میری بیتابیاں اس کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔

——— "آپ کو معلوم ہے کہ میں دنیا کو ہمیشہ قمارخانہ کہا کرتا تھا! لیکن یہ نہ سمجھ میں آتا تھا کہ اس میں بازی کس طرح لگانا چاہئے کہ جیت اپنی رہے۔ میں اس دس سال کے عرصہ میں کامل ۶ سال تک یوروپ میں رہا اور وہاں جاکر معلوم ہوا کہ یہ کھیل کس طرح کھیلا جاتا ہے، میں نے اس فن کو وہاں سیکھا، اور پھر اس کا علم صرف مجھی کو ہے کہ کس بیدردی کے ساتھ اپنے دین، ایمان، اپنے اخلاق و انسانیت یہاں تک کہ اپنی روح کی قربانی اس پر چڑھانیکے بعد میں نے اس فن کو حاصل کیا اور پھر چونکہ میں نے اس کو نہایت گراں قیمت دیکر حاصل کیا ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ میں اس کو عزیز نہ سمجھوں اور اب اس کے نتائج سے متمتع نہوں ـ یاد رکھئے کہ اگر ضرورت ہوئی تو میں آپ کو بھی اپنے اس کھیل سے دہوکا دینے میں دریغ نہ کروں گا اور میں ایک لمحہ کے لئے بھی تاسف نہ کروں گا اگر اپنے ذرا سے نفع کے لئے آپ کو بڑے سے بڑا نقصان کسی وقت پہونچا دوں"

میں نہایت حیرت سے اُس کی گفتگو سن رہا تھا اور اس کا ہر فقرہ میری نگاہ سے ایک حجاب اٹھاتا جاتا تھا۔ موٹر آہستہ ہوکر ساحل دریا کی ایک شاندار کوٹھی کے احاطہ میں داخل ہوا اور رواق (Portico) میں پہونچکر ٹھہر گیا۔ تمام احاطہ، کوٹھی کے در و دیوار، رواق کی محراب، زینہ، چھت، ستون، غرض اس عمارت کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں پھول ہی پھول نظر آتے ہوں سامنے نہایت ہی شگفتہ اور پاکیزہ خانہ باغ محرابوں اور دیواروں پر خوشنما بیلیں چھت میں معلق گملے، اور جا بجا خوبصورت چڑیوں کے پنجرے، یہ تھا وہ سب سے پہلا منظر جو میرے سامنے آیا ـــ خادم نے دروازہ کھولا اور افضال ایک ایسی شان کے ساتھ جیسے سرمایہ دارانہ تمکنت سے

زیادہ ایک شاہانہ تسلط کا غرور پایا جاتا تھا، نیچے اترا اور نرم ایرانی قالینوں کے فرش سے گزرتا ہوا مجھے ڈرائنگ روم میں لے گیا جس کی پر تکلف آرائش یقیناً جنت قلب و روح تھی۔ میں اپنے معمولی ملبوس اور دہقانی وضع میں یہاں بیٹھا ہوا، خود اپنے کو برا معلوم ہو رہا تھا، اور بعض مرتبہ یہ بھی خیال پیدا ہوتا تھا کہ کہیں افضال کو بھی میرا آنا ناگوار نہ ہوا ہو ——— افضال بھی اسی کوچ پر بیٹھ گیا جہاں میں بیٹھا ہوا تھا اور بولا کہ "فرمائیے آپ داستان سننے نہیں بلکہ دیکھنے کے لئے کب تک طیار ہو سکیں گے"۔ اس کے چہرہ کے نشاط، اور بے اختیارانہ تبسم کو دیکھ کر اس کی وہ تحریر میری نگاہوں کے سامنے آ گئی جس کو پڑھکر میں یہاں آیا تھا، اور ان سب باتوں کو مربوط کرنے کے بعد میں سمجھ گیا کہ اس کا مقصود کیا تھا۔ میں نے نہایت ہی غیر محسوس طور پر اپنی حالت کا مطالعہ کیا اور بولا "کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تمھاری داستان صرف سن لیجائے" وہ شروع ہی سے بے انتہا حساس تھا اور معمولی سی بات میں اس کی باریک جلد کے نیچے خون دوڑ جاتا تھا۔ اس وقت بھی اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر رنگین ہو گیا اور نہایت ہی ہلکی سی خشونت کے ساتھ بولا "ممکن ہے لیکن آپ کو یقین نہ آئے گا"۔ میں نے پھر اُسے مستفسرانہ انداز سے دیکھا — اب اُس پر ایک خاص کیفیت طاری تھی، نہایت بیخودانہ انداز سے بولا "اگر میں آپ سے کہوں کہ میں نے چاند کو طلوع ہوتے دیکھا تو آپ یقین کریں گے لیکن اگر میں یہ کہوں کہ چاند میری آغوش میں آ گیا تو آپ کبھی باور نہ کریں گے، اسی طرح اگر میں یہ بیان کروں کہ شفق کی رنگینیاں، بہار کی عطر بیزیاں مجسم ہو کر میرے پہلو سے ملگئیں تو بھی آپ کو یقین نہ آئے گا ——— یونان کی دیوی زہرہ کا مجسمہ ایک مادی حقیقت ہے جس کا مشاہدہ ہر وقت ہو سکتا ہے، لیکن اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ۔ اس پیکر سنگین میں کبھی کے لئے کبھی جان بھی آ جاتی ہے تو آپ کا کیا کوئی بھی اس کی تصدیق نہ کرے گا۔ پھر آپ ہی بتائیے کہ میرا افسانہ سننے کی چیز ہے یا دیکھنے کی؟" افضال یوں تو ہمیشہ سے حسناً و فکراً شاعر تھا، لیکن اب میں اسے مقال کے لحاظ سے بھی شاعر دیکھ رہا تھا۔ وہ گفتگو کر رہا تھا اور اس کا تنفس تیز ہوتا جا رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جذبات کے لحاظ سے وہ اپنے سینہ کو بہت تنگ پاتا ہے ——— اس نے قریب کی میز سے شیشہ اٹھا کر گلاس میں شراب انڈیلی اور میرے سامنے بڑھایا۔ میرے ہلکے تبسم سے وہ میرے انکار کو سمجھ کر بغیر کسی مزید اصرار کے خود پی گیا اور میز پر گلاس کو رکھتے ہوئے یہ شعر نرم سروں میں گنگنانے لگا:۔

نخستیں بادہ کاندر جام کردند
ز چشم مست ساقی وام کردند

نیاز

نوٹ:۔ بعد کے واقعات ماہ آئندہ کی اشاعت میں درج ہوں گے

انتخاب اودھ پنچ:۔ ۱۸۷۷ء کے اودھ پنچ کی جلدوں کا انتخاب قیمت صرف عہ (منیجر نگار بک ایجنسی نظیر آباد لکھنؤ)

چنگاری

(فسانہ)

(بہ سلسلہ ماسبق)

(۴)

مس ہلن کو خلد آباد میں قیام کئے ہوئے ایک ہفتہ اور گزر گیا اور اسی دوران میں یوسف کو خدا جانے کتنی آزمائشوں سے گزرنا پڑا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک وہ اسی سے نا آشنا تھا کہ مس ہلن کی یہ تمام جسارتیں کس مقصود کے لئے تھیں اور وہ کیسی مخفی لیکن مہلک جنگ اس کی فطرت سے کر رہی تھی۔

یوسف بڑا ذی فہم تھا، ذہین تھا، اخذ نتائج میں اس کا دماغ بہت جلد سبقت کرتا تھا، لیکن صرف ان باتوں میں جنکا تعلق محض نگاہ سے ہو یا دماغ سے ــــ اس زمانہ میں بارہا ایسے موقع پیش آئے کہ اس کی نگاہوں نے اپنا پیام اس کے قلب و روح تک پہونچانا چاہا لیکن وہ اس سے زیادہ کامیاب نہ ہو سکیں، کہ یوسف کے قلب نے اُن کی آزادی کو سلب نہیں کیا۔ اس نے مس ہلن کو بعض مرتبہ ایسے ایسے حال میں دیکھا کہ کوئی دوسرا اس کی جگہ ہوتا تو شاید پھر سانس نہ لیتا، لیکن اُس نے زیادہ سے زیادہ جو کیفیت محسوس کی وہ صرف اس قدر تھی کہ وہ اپنی نگاہوں کو نسبتاً کچھ زیادہ آسودہ پاتا تھا لیکن قلب ہنوز بے خبر تھا۔

اُس کی زندگی یکسر بے احتیاج تھی، وہ اپنی امیدوں کے لحاظ سے اس قدر مستغنی واقع ہوا تھا کہ کم از کم یہ بات اُس کی سمجھ میں نہ آتی تھی کہ نظام تمدن میں عورت کونسی چیز مرد کو سونپ سکتی ہے جو اس کے پاس نہیں ہے اور مرد کے پاس کیا نہیں جس کی خواہش وہ عورت سے کرے۔

اس دوران میں مس ہلن نے خود چھیڑ چھیڑ کر، شعر و شاعری، موسیقی، و نقاشی، عشق و حسن، مرد و عورت، اور اسی طرح کے اور بہت سے مسائل پر یوسف سے گفتگو کی، جن کا تعلق انسان کی صرف شباب سے ہے اور ان کے علاوہ نظام تمدن، ہیئت اجتماعیہ اصول ارتقاء وغیرہ پر بھی بحث کی جو ایک زیادہ سنجیدہ اور متفکر دماغ کے لئے باعث دلچسپی ہو سکتے ہیں، لیکن یوسف کے چہرہ پر نہ ان مباحث سے کوئی رنگ آیا اور نہ ان مباحث کے دوران میں اس نے مسکرانا ترک کیا ــــ لیکن ایک نہایت ہی ہلکا سا تغیر یہ ضرور محسوس کیا گیا کہ جو وحشت اس کو پہلے ہوتی تھی اب اس قدر نہیں تھی بلکہ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا کہ اگر مس ہلن خاموش رہتی تو وہ خود کوئی نہ کوئی بات ایسی کہہ دیتا جس سے وہ چونک پڑتی اور وہ اس چونک پڑنے سے تقریباً وہی لطف لیتا جو کسی کے چھیڑنے سے حاصل کیا جاتا ہے اسی کے

ساتھ ایک تغیر اور بھی اس میں پیدا ہوا اور وہ یہ کہ جب مس ہلن اپنے اہتمام سے کھانا طیار کرا کے اس کو کھلاتی تو وہ نسبتاً زیادہ لذیذ معلوم ہوتا اور جس دن اُس کو باہر جنگل میں تنہا کھانا پڑتا تو مس ہلن اُسے ضرور یاد آجاتی اور جلد ہاتھ کھینچ لیتا ۔۔۔

بہر حال یوسف خود محسوس کرتا یا نہ کرتا لیکن اس میں یہ تغیرات ضرور پیدا ہو چلے تھے جن کو مس ہلن بھی سمجھ رہی تھی ۔ مگر اس تغیر کی رفتار اس قدر سُست تھی کہ بعض اوقات وہ گھبرا جاتی ۔۔۔۔

دو دن اور گزر گئے تیسرے دن یوسف حسب معمول صبح کی چاء پیکر کھیتوں کی طرف نکل گیا اور چونکہ چلتے وقت مس ہلن کے اصرار پر وعدہ کر گیا تھا کہ دوپہر کا کھانا وہ انھیں کے ساتھ کھائے گا اس لئے اُس نے چاہا کہ جلد کاموں سے فارغ ہو جائے اور مس ہلن کو زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے ، لیکن اتفاق سے اسی دن تقاوی کے کچھ قصے پیش آگئے اور اُمید سے زیادہ اس کا وقت صرف ہو گیا ۔

وہ ہمیشہ پیدل جانے اور آنے کا عادی تھا لیکن آج دیر ہو جانے کے سبب سے اس نے گھوڑا طیار کرایا اور اس پر سوار ہو کر بھگاتا ہوا چلا ۔۔۔۔ مس ہلن نہایت بیتابی سے یوسف کا انتظار کر رہی تھی اور دیر ہو جانے سے کچھ متفکر بھی تھی کیونکہ یوسف کی پابندی اوقات کا حال اسے معلوم تھا اور وہ جانتی تھی کہ بغیر کسی خاص سبب کے ممکن نہیں کہ یوسف اتنی دیر لگا دے ۔

بارہ بجے کھانے کا وقت مقرر تھا ، لیکن یوسف تین بجے تک بھی وہاں نہ پہونچ سکا ، مس ہلن کی تشویش اب ضبط سے باہر ہو گئی اور اس نے آدمی کو حکم دیا کہ جا کر مکان پر دریافت کرے ، لیکن اتنے ہی میں سایوسف آگیا ' اس حال میں کہ چارپائی پر بیہوش و مجروح پڑا ہوا تھا اور کچھ دہقانی اس کی چارپائی کو اٹھائے لا رہے تھے ۔ قصہ بہت مختصر تھا اور وہ یہ کہ گھوڑا بھڑک کر بھاگ نکلا اور یوسف جب گرنے لگے تو پاؤں رکاب میں اُلجھ گیا جس سے سر ، چہرہ ، اور کہنیوں کو زیادہ صدمہ پہونچا ۔

مس ہلن نے فوراً اندر مسہری پر لٹا کر وہ تمام تدابیر شروع کر دیں ، جو ایسی حالت میں ایک مغربی خاتون کر سکتی ہے اور اسی کے ساتھ اس نے قصبہ کے ڈاکٹر کو بلایا اور فوراً ایک خط مفصل دیکر آدمی کو علی گڈھ کے سول سرجن کے پاس روانہ کیا ۔۔۔۔

(۵)

اس کے بعد یوسف پر تقریباً ایک ہفتہ ایسا گزرا کہ اس کے انجام کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم نہیں ہو سکتی تھی ، تپ کی شدت اور دماغی خرابی نے ایسی صورت اختیار کر لی تھی کہ بعض مرتبہ ڈاکٹر بھی مایوس ہو گئے ، لیکن مس ہلن کی محنت و تیمارداری کا یونہی ضائع جانا مقدر نہ تھا اس لئے آہستہ آہستہ تمام شدید علامتیں کم ہونے لگیں اور جب دسویں دن یوسف نے اول مرتبہ ہوش میں آکر آنکھ کھولی تو اپنے ماحول کو دیکھکر وہ تھوڑا سا متعجب ہوا ، لیکن پھر خود ہی آنکھ بند کر کے اُس نے غور کر کے سمجھ لیا کہ اُس دن گھوڑے سے گرنے کے یہ نتائج ہوں گے ۔ اُس نے پھر آنکھ کھولی اور مس ہلن کو اپنے سرہانے دیکھ کر اپنی آنکھوں سے انتہائی جذبۂ منت پذیری ظاہر کرتے ہوئے ، زبان سے بھی شکریہ ادا کیا اور پوچھا کہ " میں کتنے دنوں سے آپ کا مہمان ہوں ؟ " ۔ مس ہلن

پہلی مرتبہ اس کے اسلوب بیان کو اس قدر ادبی پہلو لئے ہوئے دیکھکر مسکرائی اور بولی کہ "بارہ دن سے یہ شرف مجھے حاصل ہے"۔
یوسف نے سخت حیرت کے ساتھ بارہ دن کے لفظ کو دہرایا اور جیسا کہ تعجب کی حالت میں اس کی عادت تھی اس نے داڑھی پر ہاتھ پھیرنا چاہا، لیکن جب ٹھوڑی سے آگے اُسے بالکل خلا نظر آیا تو اُسنے مزید تحقیق کے لئے اپنے سارے چہرہ کا جائزہ لیا اور اسی کے ساتھ مسہری کے سامنے ہی ایک بڑا آئینہ دیوار میں لگا ہوا تھا اُس پر نگاہ گئی تو معلوم ہوا کہ نہ صرف مونچھ داڑھی بلکہ سر بھی بالکل صاف تھا۔ سر میں، گالوں ٹھوڑی کے نیچے جا بجا پھاہے لگے ہوئے تھے اور چونکہ اس وقت تک اُس نے اپنے آپ کو بے ریش و بروت کبھی نہ دیکھا تھا، اس لئے اُسے اپنی صورت دیکھکر ہنسی آگئی اور مس ہلن سے مخاطب ہو کر کہا کہ "میں بھی اس وقت کس قدر بھیانک نظر آتا ہوں"۔
مس ہلن ——— "پہلے سے کم، لیکن میں خوش ہوئی یہ معلوم کرکے کہ کم از کم آپ کے اندر احساس حسن و قبح تو کچھ پیدا ہوا، ورنہ وہ شخص جو بلا کسی سبب کے داڑھی چھوڑ سکتا ہے، اُس کو اس کے نذرانہ ہوجانے کی بھی کوئی فکر نہ ہونی چاہئے۔ جب تک کسی فعل کا تعلق جذبات سے نہ ہو اسپر غور کرنا لایعنی سی بات ہے ——— کہئے اب آپ کا مزاج کیسا ہے؟ داڑھی کا افسوس نہ کیجئے، خس و خاشاک کی دنیا میں کیا کمی"۔
یوسف ——— "کیا مجھے اُٹھنے کی اجازت ہے؟"
مس ہلن ——— "اُٹھنے کی حاجت ہی کیا ہے۔ میری رائے میں ابھی آپ کو پورے سکون کی ضرورت ہے۔ آپ کو خبر نہیں کہ یہ ہفتہ آپ پر اور ہم سب پر کس قدر سخت گزرا ہے۔ آپ کا دماغ اس قدر متاثر تھا کہ ایک ایک ہفتہ تک تو ہوش آیا ہی نہیں اور اس کے بعد جو تپ کے ساتھ ہذیان شروع ہوا تو کل شب کو مشکل سے خدا جانے کن کن تدبیروں کے بعد اس کا دورہ ختم ہوا"۔
یہ کہکر مس ہلن نے گھڑی دیکھی اور فوراً اٹھکر میز سے دوا کی شیشی لائی، گلاس میں ایک نشان اس کا خالی کرکے، یوسف کو سہارا دیکر اٹھایا اور دوا دیکر، ایک جرعہ افشردۂ نارنج کا، اور کچھ دانے انگور کے کھلائے اور پھر نرمی سے تکیہ کے اوپر اُس کا سر رکھ کر سامنے کرسی پر بیٹھکر کتاب اُٹھائی اور یوسف سے مخاطب ہو کر بولی "کیا آپ سنیں گے"۔ یوسف جو اسوقت مس ہلن کی ان تمام عنایتوں اور قربانیوں پر غور کرکے اس خیال سے پریشان ہو رہا تھا کہ وہ کیونکر ان کا عوض دے سکتا ہے، آنکھ بند کرکے خاموش ہو گیا اور مس ہلن کا فقرہ اس انہماک میں اس کے کانوں تک نہ پہونچ سکا مس ہلن، یہ دیکھکر کہ یوسف نے آنکھیں بند کرلی ہیں اور شاید وہ اب آرام کریگا، آہستہ آہستہ کرسی سے اُٹھی اور دروازوں کے پردے کھینچکر دبے پاؤں وہاں سے جانے لگی تاکہ وہ اطمینان سے سو جائے، لیکن یوسف جو ان تمام باتوں کو دیکھ رہا تھا، گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور بولا کہ "نہیں آپ یوں نہیں جا سکتی ہیں، ادہر تشریف لائیے"۔ نہ صرف اس کی آواز میں اس وقت ایک آمرانہ لہجہ تھا، بلکہ اُس کے چہرہ کے خط و خال سے بھی عجیب طرح کی خشونت پیدا تھی اور اس کے تیوروں سے انتقام ٹپک رہا تھا۔
مس ہلن نے پلٹ کر دیکھا تو اس خیال سے نہیں کہ یوسف نے اسے روکا تھا بلکہ محض اس بنا پر کہ کہیں اس طرح دفعتہ اپنے آپ اٹھ بیٹھنا

یوسف کے لئے مضرت رساں نہ ہو، تیزی کے ساتھ واپس گئی اور یوسف کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر چاہا کہ اُسے پھر لٹا دے، لیکن اُسنے نہایت غور سے ہلن کا چہرہ دیکھکر اس کے دونوں ہات اپنی پیٹھ سے ہٹا دئے اور کہا کہ "معاف فرمائے میں لیٹو نگا نہیں، آپ بیٹھ جائیے اور میری ایک بات کا جواب دیجئے"

مس ہلن بیٹھ گئی تو یوسف نے پھر اس کی صورت کو نہایت غور سے دیکھا اور دریافت کیا کہ "آپ کو کیا حق حاصل ہے کہ میرے لئے اس قدر تکلیف برداشت کریں؟"

مس ہلن کو اس فقرہ پر ہنس پڑنا چاہئے تھا، لیکن اُس نے ضبط سے کام کیا کیونکہ وہ سمجھتی تھی جس مقصد کے حصول کے لئے اُس نے اپنا اس قدر وقت ضائع کیا تھا اس کا اب وقت آگیا ہے یا آنے والا ہے اور اس لئے اُس نے حد درجہ سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا کہ "آپ کو کیا حق حاصل تھا کہ میرے سامنے یوں گھوڑے سے گر کر بیہوش و مجروح حالت میں آتے"

یوسف:- "اسپر تو مجھے کوئی اختیار نہ تھا"

ہلن:- "اور اسپر مجھے نہ تھا"

یوسف:- "آپ غالباً بہت خوش ہونگی کہ آپ نے اپنی الفت و عنایت، ایثار و قربانی سے کام لیکر میری تیمار داری کی یہاں تک کہ میں اچھا ہو گیا لیکن شاید آپکو یہ علم ہوگا کہ آپ نے مجھے ایک مرض سے اچھا کرکے دوسرے مرض میں مبتلا کر دیا جو اس سے بہت زیادہ سخت ہے۔ میرا جسم تو شاید یوں بھی صحیح ہو جاتا، آپ ہوتیں یا نہ ہوتیں لیکن یہ جو آپ نے میری روح کو علیل بنا دیا ہے اس کا علاج تو شاید آپ کے پاس بھی نہ ہوگا۔ خدا کے لئے بتائیے میں کیونکر آپ کی عنایتوں کا اعتراف کر سکتا ہوں، مجھے سخت وحشت ہے اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس طرح اس بار کو برداشت کر سکونگا۔ میرے جسم پر تو آپ کے ہات کی ہر اونگلی اب گرم لوہے کی سلاخ کی طرح محسوس ہوتی ہے۔ پھر اگر آپ اس مسئلہ میں خاموش رہیں گی تو میری تمنا اس سے زیادہ اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ خدا کرے آپ اس سے زیادہ شدید بیمار پڑیں اور میں آپ سے زیادہ انہماک کے ساتھ آپ کی تیمار داری میں مصروف ہوں"

مس ہلن یہ سنکر بے اختیار ہنس پڑی اور بولی کہ "اگر آپ کی تیمار داری مجھے اچھا نہ کر سکی تو پھر کیا ہوگا"

—— "کیا ہو سکتا ہے سوا اس کے کہ میں اپنی زندگی کو بھی آپ کے لئے تباہ کر دوں"

—— "کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ کسی کے لئے زندگی کیونکر تباہ کی جاتی ہے"

یوسف پر اس سوال کا اس قدر سخت اثر پڑا کہ وہ گھبرا کر مسہری سے اُٹھ کھڑا ہوا لیکن چونکہ ابھی کمزوری بہت زیادہ تھی اس لئے اُسے چکر آیا اور زمین پر گر پڑا جس کی وجہ سے اس کے سر کا زخم پھر پھٹ گیا اور تھوڑی دیر کے لئے مس ہلن کے سامنے پھر وہی منظر آگیا جو حادثہ کے اول دن پیش آیا تھا۔ (باقی)

نیاز فتحپوری

باب الاستفسار

وہی یوسف، وہی افسانۂ حسن

(جناب سید فخر عالم فاضل فرنگی محلی - بھاگلپور)

نگار ماہ فروری ۱۹۲۸ء کے باب الاستفسار کی تحت میں جناب نے حسن یوسف کا غیر مصدق عن القرآن ہونا ثابت کیا ہے اور اپنے خیال کو تقویت پہونچانے کی غرض سے بہت کچھ جدوجہد کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ نے زیادہ غور و فکر سے کام نہیں لیا، اگر آپ سورۂ یوسف پر غائر نظر ڈالتے تو آپکو یوسف علیہ السلام کا غیر معمولی حسین ہونا معلوم ہوجاتا۔ بہرکیف میں آپ ہی کی تحریر سے بتا دونگا کہ حسن یوسف کا تذکرہ قرآن میں موجود ہے اور کہیں کہیں آپ کی تحریر کے علاوہ مفسرین کے اقوال اور احادیث سے بھی مدد لونگا۔

سب سے پہلے آپنے اخوان یوسف کے مکالمہ سے فائدہ اُٹھانا چاہا ہے اور یہ تحریر فرمایا ہے کہ اُن کے بھائیوں نے اپنے باپ کی محبت یوسف کی طرف زیادہ دیکھی تو بولے کہ ہمارا باپ، یوسف اور اس کے بھائی کو زیادہ چاہتا ہے اگر حسن باعث محبت ہوتا تو ویسا تذکرہ کرتے لیکن اس کا تذکرہ نہیں کیا گیا جس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں اذ قالوا لیوسف واخوہ احب الی ابینا منا ونحن عصبۃ ان ابانا لفی ضلال مبین۔ جبکہ کہا ان سبھوں (اخوان یوسف) نے کہ ہمارا باپ، یوسف اور اس کے بھائی کو زیادہ چاہتا ہے حالانکہ ہم لوگ عصبۃ ہیں درحقیقت ہمارا باپ کھلی ہوئی گمراہی میں ہے۔ اس آیت میں وجہ زیادتی محبت تو کچھ بھی مذکور نہیں ہے تو کیا اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام میں کوئی خصوصیت و خوبی تھی ہی نہیں؟ پھر بغیر کسی خصوصیت و خوبی کے باپ کی غایت نظر شفقت اُن دونوں بھائیوں پر کیوں تھی اور وہ کون سی شے ان دو ہستیوں میں پنہاں تھی جو ان سبھوں میں نہ تھی یقیناً آئندہ ملنے والے مدارج تھے جو یعقوب علیہ السلام کو بذریعہ وحی معلوم ہوچکے تھے۔ لیکن صرف یہی ایک باعث نہ تھا بلکہ جمال یوسفی بھی تھا جس کا ثبوت واقعہ چاہ سے ملتا ہے یعنی اگر وجہ محبت صرف نبوت ہوتی تو اخوان یوسف کو دونوں بھائیوں کے قتل کی سازش کرنی چاہیے تھی کیونکہ حضرت یوسف اور بنیامین دونوں نبوت کے لئے منتخب ہوچکے تھے لیکن قرآن سے صرف یوسف علیہ السلام کے قتل کی سازش کا پتہ چلتا ہے۔ جیسا کہ اُن کے بھائیوں نے آپس میں مشورہ کیا تھا کہ۔ اقتلوا یوسف او اطرحوہ ارضاً یخل لکم وجہ ابیکم وتکونوا من بعدہ قوماً صالحین۔ یوسف کو مار ڈالو یا پھینکدو کسی زمین پر تاکہ تمھارے باپ کی خاص توجہ تم لوگوں کی طرف ہوجائے اس کے بعد قوم صالح ہوجانا۔ کیا اس آیت سے بھی حضرت یوسف کا حسین تر ہونا ثابت نہیں ہوتا؟ حالانکہ بنیامین اور یوسف ایک ہی ماں کے پیٹ کے اور ایک ہی درجہ رکھنے والے تھے۔ لیکن پھر بھی ان دونوں

بھائیوں کے درمیان تقابل کرنے کے بعد جو چیز بنیامین سے یوسف کو بڑھا دیتی ہے وہ حسن ہی نظر آتا ہے اور آپ کا یہ کہنا کہ ان کے بھائیوں نے یوسف کے جمال کا ذکر نہیں کیا قابل افسوس ہے۔ سب سے پہلے آپ کو ان کے طرز تکلم کو ملاحظہ فرمانا چاہیے تھا بھلا جو شخص اپنے باپ کو گمراہ یا خطا وار رکھے اور اُس شخص کے نقایص کو دکھانے بیٹھے جس کی گود میں پل کر جوان ہوا ہے، کیا آپ اُس کی زبانی سوتیلے بھائی کے محاسن سننے کے منتظر ہیں؟ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ؎

ہنر بچشم عداوت بزرگ تر عیبست

مکالمہ یا مشورت اخوان یوسف کے بعد آپ نے کارواں کی آمد کے واقعہ کو پیش کرتے ہوئے یا بشریٰ ہذا غلام سے اپنے قول پر استدلال قائم کرنا چاہا ہے لیکن آپ کو خبر نہیں کہ لفظ بشریٰ کے بعد یہ کہنے کی کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی کہ یہ کیسا حسین وخوبصورت لڑکا ہے، حیرت واستعجاب کا اظہار اسیوقت کیا جاتا ہے جبکہ انسان کوئی نئی چیز دیکھتا ہے۔ اگر اچھی اور خوبصورت شے نظر آگئی تو بیساختہ انسان کہہ اٹھتا ہے "اہا ہا" یہی حال وہاں بھی ہے کہ ان لوگوں نے ایک غیر معمولی حسین لڑکے کو دیکھا تو خوشی سے اچھل پڑے اور بولے "یا بشریٰ ہذا غلام" اماں واہ کیا لڑکا ہے"! اور بشریٰ سے آدمی کا نام مراد لینا بر بنائے روایت صحیح غلط ہے۔ پھر آپ فرماتے ہیں کہ عزیز مصر جب حضرت یوسف علیہ السلام کو گھر لیکر آیا تو اسوقت بھی حسن کا ذکر نہیں کیا۔ سوال یہ ہے کہ جب تک یوسف علیہ السلام میں کوئی خاص بات نہ تھی تو پھر عزیز نے خرید کر متبنیٰ کیوں بنایا؟ اسوقت موجودہ اور فوری کشش جو یوسف علیہ السلام میں پائی جاتی تھی اوجسے دیکھکر عزیز مصر متبنیٰ بنانے کے لئے تیار ہو گیا اور جس کو دیکھکر عزیز کے دل کا کنول کھل گیا وہ آپ کا حسن ہی تھا۔ اس لئے کوئی ضرورت نہ تھی کہ عزیز آپ کے حسن کا بھی تذکرہ کرتا۔ کیونکہ حسن تو زلیخا کے سامنے موجود ہی تھا۔ پھر آپ آگے چلکر۔ ولما بلغ اشدہ آتینہ حکما وعلما میں جمال یوسفی کی جستجو کرتے ہیں۔ حالانکہ یہاں تو خدا یہ کہہ رہا ہے کہ جب یوسف پر مصائب والام کی انتہا نہ رہی اور اس نے ایسی تکلیفوں میں بھی صبر کیا یہانتک کے دورفتن کی جوانی پوری ہو چکی یعنی ساری مصیبتیں ختم ہو گئیں اور آخر تک یوسف علیہ السلام نے خدا کو نہ بھلایا تو اب خدا صبر کے بدلہ میں علم وحکمت عطا کرتا ہے چنانچہ آگے خود ہی فرماتا ہے کذالک نجزی المحسنین۔ اسیطرح ہم نیکی کرنے والوں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔ اور یہ علم وحکمت کا عطیہ مصائب کے بعد ملتا ہے اور حسن تو خدا پہلے ہی دیچکا تھا اُسوقت تو جدید عطیات عنایت ہو رہے ہیں۔ قدیم عطیات کی یاد دہانی یا ذکر کی کیا ضرورت تھی۔

اگر میں آپ ہی کے قول کو صحیح مان لوں تو بھی مقصد حاصل ہے کیونکہ آپ نے ولما بلغ سے یوسف علیہ السلام کی جوانی مراد لی ہے اور تحریر فرمایا ہے کہ خدا فرماتا ہے کہ جب یوسف جوان ہوا تو ہمنے علم وحکمت سکھائی تو بندہ پرور ذرا غور فرمائیے کہ یہاں تو ان نعمتوں کا ذکر ہے جو عالم شباب میں خدا نے یوسف کو دی ہیں اور نعمت حسن تو قبل ہی اُن کو مل چکی تھی پھر جدید

نعمتوں کے ساتھ قدیم عطیہ کی جستجو کیا معنی رکھتی ہے اگر حسن بھی جوانی کے بعد ملتا ہے تو یوسف علیہ السلام کو بھی ملتا لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے یعنی انسان حسین یا بدصورت ماں کے پیٹ ہی سے پیدا ہوتا ہے تو پھر یوسف علیہ السلام کیونکر جوان ہونے کے بعد نعمت حسن سے معمور ہوتے اور جب یہ بات تصدیق شدہ ہے تو خدا کی خاموشی بھی اس موقع پر ذکر حسن سے عین دانائی پر مبنی ہے۔

ملا طیخ کی تشریح کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ قرآن نے زلیخا کے تعشق یا لگاوٹ کا ذکر کرتے وقت بھی حسن یوسفی کی طرف ارشادہ نہیں کیا میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ جیسا ادیب و افسانہ نگار یہاں بھی سپر ڈال دیتا ہے حالانکہ عورتوں کے عشق و تعشق کا دارومدار ہی حسن ظاہری پر ہے جس کی مزید توضیح کی یہاں گنجایش نہیں۔

مجھے پھر اظہار حیرت کی ضرورت پیش آگئی کیونکہ آپ عاشقوں کی جھرمٹ میں ہو نکر اور حقیقت کا اقرار کرنے کے بعد پھر حسن سے انکار کرتے ہیں اور جناب نے غضب تو یہ کیا کہ پہلے قرآن سے استدلال کرنے کا دعویٰ کیا اور پھر مفسرین کے اس قول کو بھی آڑ بکڑی کہ چرچا کرنے والی عورتیں عزیز مصر کے ہاں کام کرنے والی یا آنے جانے والی تھیں۔ حالانکہ یہ آپ کے اصول کے خلاف ہے۔ اگر آپ مفسرین کے اقوال سے بھی مسئلہ میں سند لینا چاہتے ہیں تو کوئی جھگڑا ہی باقی نہیں رہتا، اس لئے کہ سب سے زیادہ قرآن کو اگر کسی نے سمجھا ہے تو حضور اکرم صلعم ہیں اور آپ کا ارشاد حسن یوسفی کی تعریف میں موجود ہے۔ یعنی جب حضرت عائشہ صدیقہ نے حسن یوسفی اور حسن نبوی کا موازنہ حضور سے چاہا تو آپ نے فرمایا ہم میں اور یوسف میں ملاحت وصباحت کا فرق ہے۔ پھر حدیث کے ہوتے ہوئے حسن یوسفی سے کون انکار کر سکتا ہے۔ مزید تشریح کے لئے آنحضرت کی معراج والی حدیث ملاحظہ فرمائیے۔ قال مررت بیوسف علیہ السلام لیلۃ عرج بی الی السماء فقلت بجبریل علیہ السلام من ہذا فقال ہذا یوسف فقیل یا رسول اللہ کیف رایتہ قال کالقمر لیلۃ البدر نقلہ الرازی۔ جب حضور صلعم نے یوسف علیہ السلام کے حسن کے متعلق ہلال بدر فرمایا تو پھر حسن یوسفی میں ہما شما کو شک کی کب گنجائش ہے۔ خیر یہ تو الفاظ معترضہ تھے۔ اب آپ مکر کو ملاحظہ فرمائیے۔

آپ مکر سے دو مطلب مراد لیتے ہیں اول شہری عورتوں نے زلیخا کی محبت کا چرچا کیا تو زلیخا نے ان کے مکر کو سمجھکر دعوت دی۔ دوم شہری عورتوں میں اور زلیخا میں یوسف کو رام کرنے کے لئے کوئی حیلہ طے ہو گیا تو غرض یہ ہے کہ ان عورتوں کا محبت کرنا یا زلیخا سے مشورت کے بعد یوسف کو قابو میں لانے کے لئے ہاتھ کاٹ لینا قابل غور ہے۔ گرچہ میں اس کو ہرگز تسلیم نہیں کر سکتا کہ زلیخا اور دوسری محبت کرنے والی عورتوں نے ملکر یوسف کو رام کرنے کی ترکیب کی ہو اس لئے کہ رقابت ہرگز اس کی مقتضی نہیں ہے اور خاص کر عورتوں کی رقابت کہ اپنے معشوق کو اپنی طرف راغب کرنے کے لئے مجموعی قوت صرف کریں۔ کیونکہ یہ بالکل خلاف

خلاف فطرت ہے۔

اب رہی پہلی بات یعنی زلیخا کے ماسوا دوسری عورتوں نے جذبۂ محبت سے مجبور ہو کر دیدار یوسفی کے لئے طعنہ زنی کا بہانہ نکالا۔ تو دیکھنا یہ ہے کہ کیا مصر میں کوئی مرد ایسا نہ تھا جس پر یہ عورتیں اپنا دام فریب بچھاتیں۔ صرف یوسف علیہ السلام میں وہ کون سی ایسی خصوصیت تھی کہ وہ عورتیں سارے مصر کی مردوں کو چھوڑ کر یوسف علیہ السلام پر جان دینے لگیں۔ یقیناً آپ کا غیر معمولی حسن تھا جو اور مردوں میں نہ تھا پس کیا پھر آپ یہ کہنے کو تیار نہیں کہ قرآن سے اشارتاً و کنایۃً بھی حسن یوسفی کا پتہ نہیں چلتا۔ دوسرے فلما راینہ سے کافی ثبوت یوسف علیہ السلام کے غیر معمولی حسین ہونے کا ملتا ہے اس لئے کہ حرف فا کا استعمال کلام عرب میں تعقیب کے لئے آتا ہے یعنی تراخی بلا مہلت جس سے ثابت ہو گیا کہ ان کی عورتوں نے دیکھتے ہی فوراً عالم بیخودی میں اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے اور بول اٹھیں۔ ان ہذا الا ملک کریم۔ یہ انسان نہیں فرشتہ ہے۔ اور حسن حور و پری و فرشتہ عوام میں مشہور ہے۔ اور فلما راینہ یعنی جوں ہی ان پر نظر پڑی قطعن ایدیہن۔ ان عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے اب آپکا یہ کہنا کہ یوسف علیہ السلام کو ڈرانے دھمکانے اور فریب میں لانے کے لئے اپنا ہاتھ کاٹ ڈالا ہرگز صحیح نہیں۔ جیسا میں اوپر لکھ آیا ہوں کہ حرف فا اپنی حقیقت موضوع لہ کی بنا پر بغیر بات کئے ہوئے اور ٹھہرے ہوئے ان عورتوں نے پہلی ملاقات میں اپنا اپنا ہاتھ کاٹ ڈالا تو پھر باعث قطع ید معصومیت و تقدس قرار دینا سخت غلطی ہے اور تقدس ہی مراد لیتے ہیں تو مجھے بتا دیں کہ آج تک کسی نے کسی کے تقدس پر جان دی ہو یا کم از کم ہاتھ ہی کاٹ ڈالا ہو۔ یقیناً ادب و تاریخ کے اوراق آپ کے اقوال کی تغلیط کرنے کو کافی ہیں۔ ہاں اس واقعہ کے بعد وہ عورتیں آپ کے تقدس کی قائل ہو گئیں۔ جس کا ثبوت آگے کے واقعہ سے بھی ملتا ہے۔ اور یہ تو عقل سے لگتی بات ہے کہ یوسف علیہ السلام نے ان عورتوں کے عشق و فریفتگی کو بھی ملاحظہ کیا لیکن ان کا دل نہ پسیجا۔ تو زلیخا نے مجبور ہو کر اپنی ذاتی رائے سے یا اُن عورتوں کے مشورہ سے یوسف کو قید کروا دیا کہ شاید قید کی پابندیوں سے عاجز آ کر میری طرف راغب ہو جائیں، لیکن آپ نے ایسا نہ کیا۔ یہاں تک کے عزیز مصر نے ان کے علم تعبیر رویا کا حال معلوم کر کے ان کو قید خانہ سے بلا بھیجا تو انھوں نے اپنے تقدس و حیا و صداقت کی شہادت انہیں عورتوں سے چاہی جو نیر فریب کا جال بچھانے کو تیار تھیں۔ اور جب ان عورتوں سے عزیز مصر نے پوچھا تو انھوں نے صاف لفظوں میں کہدیا کہ ہم نے یوسف میں کوئی لغزش نہیں پائی وہ نہایت صالح و نیک مرد ہیں۔ عزیز کو اسیقدر تحقیق کی ضرورت تھی اور اسیقدر عزیز نے سوال بھی کیا تھا اور اسی کی شہادت یوسف نے بھی دینی چاہی تھی نہ کہ اپنے حسن کی شہادت۔

جب مسلمہ امر ہے کہ نہ تو یوسف علیہ السلام نے حسن جتانا چاہا اور نہ عزیز نے ان کے حسن کو پوچھا تو پھر وہ عورتیں سوال سے غیر متعلق جواب کیوں دیتیں۔ اور یہاں پر حسن کے اظہار کی تو کوئی ضرورت ہی نہیں کیونکہ جب آفتاب ہماری آنکھوں

کے سامنے چمک رہا ہے تو پھر کسی سے یہ سوال کرنا کہ آفتاب میں چمک ہے یا نہیں، کس قدر حماقت و بیوقوفی کا سوال ہوگا۔ لہٰذا آپ کا بیان پر جمال یوسفی کی تلاش کرنا مہمل سا معلوم ہوتا ہے

اس مختصر تشریح کے بعد غالباً آپ مان گئے ہوں گے کہ قرآن میں کنایۃً" اور استعارتاً" حسن یوسفی کا تذکرہ موجود ہے اور یہی وہ معجزہ طرز ادا قرآن کا ہے جس نے ادباء عرب کی زبانیں بند کر دی تھی اگر استعارہ و کنایہ سے ادا مقصد محل فصاحت ہوتا تو سرکار کے حسن ظاہری کو بھی خد اصاف لفظوں میں قرآن میں ذکر کرتا لیکن بخلاف اس کے ہر جگہ اپنے حسن و جمال کو استعارہ و کنایہ میں ذکر کیا ہے۔

(جناب مولوی غلام ربانی صاحب عزیز۔ کیمبل پور)

میں اس مضمون پر قلم اٹھاتا تو ہوں لیکن آپ کا یہ فقرہ کہ "حسن یوسف کا بے نقاب کرنے والا دنیائے شعر و ادب کی بڑی خدمت انجام دیگا" دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے۔ اور گو اس وقت میں اتنا عدیم الفرصت ہوں، کہ بعض اوقات بڑے بڑے ضروری خطوط کے جواب میں ہفتوں گزر جاتے ہیں۔ اور وقت نہیں ملتا۔ لیکن یہ بحث ہی کچھ ایسی چھڑ گئی ہے کہ سمند قلم بے لگام ہو جاتا ہے اور پھر یہ بھی کچھ کم قابل فخر امر نہیں اگر میں اس طرح ۔ دنیا شعر و ادب کی کوئی خدمت سرانجام دے سکوں"

میرا خیال ہے۔ کہ آپ کو اس میں کوئی عذر نہیں ہوگا۔ اگر مکر کے معنے سازش کے لئے جائیں۔ سمعت بمکرھن کے معنے یہ ہوں گے، کہ جب زلیخا کو ان کی سازش کا جس کا آیت ماقبل الذکر میں ذکر ہو چکا ہے۔ علم ہوا تو وہ بہت تہ و بالا ہوئی اور اس نے انھیں انکی غلطی کے احساس اور اپنی مجبوری کے اظہار کے لئے دعوت کا انتظام کیا۔ جب اُنھوں نے یوسف کو دیکھا تو اس کو بڑا جانا۔ اور اپنے ہاتھ کاٹ لئے مجھے یہاں آپ سے چند باتوں سے اختلاف ہے۔

(۱) کسی شخص کے عشق و محبت کا افسانہ بیان کرتے ہوئے اپنی رائے کا ان الفاظ میں اظہار کرنا کہ ہمارے ہاں اپنے غلام سے عشق کرنا سراپا گمراہی ہے۔ اور زلیخا شدید ترین غلطی کا ارتکاب کر رہی ہے۔ عزیز مصر کی بیوی کے برخلاف، خطرناک سازش ہے۔ جس سے اس کے اخلاق اور چال چلن پر ناقابل معافی الزام اور دھبہ لگتا ہے۔

(۲) اور پھر فلما رانیہ میں لفظ رویت سے صاف ظاہر ہے۔ کہ ان عورتوں نے یوسف کو پہلی بار دیکھا تھا۔ ورنہ لفظ رویت کی تقدیم بیکار ہے۔ بلکہ کوئی ایسا لفظ لگایا جاتا۔ جو موقع کے مطابق ہوتا۔

(۳) مزید براں اکبر کا لفظ نہایت بلند آہنگی سے ان جذبات کی ترجمانی کر رہا ہے۔ جو یوسف کے دیکھنے سے ان عورتوں کے دل و دماغ پر طاری ہوئے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسا لفظ تعجب اور حیرت کے موقع پر ہی بولا جاتا ہے۔ اب صرف قابل

دریافت یہ امر ہے کہ وہ کونسی چیز تھی کہ جس سے وہ محو حیرت ہوگئیں

غالباً آپ اس امر میں مجھ سے متفق ہوں گے۔ کہ ہم فقط دیکھنے سے کسی شخص کے اخلاق اور چال چلن کے متعلق صحیح کیا غلط اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ کیونکہ اخلاق کو جانچنے کے لئے کوئی اور معیار درکار ہے۔ اور پھر نہ کسی شخص کے حسن اخلاق سے ہم ایسے سخت تاثر پذیر ہو سکتے ہیں کہ ہماری زبان سے اللہ اکبر کا جملہ تڑپ کر نکل جائے۔ پس ظاہر ہے کہ اس قدر مبہوت کن حیراں ساز اور آئینہ بنانے والا صرف حسن کا جادو ہی ہوسکتا ہے۔ ورنہ اخلاق میں یہ کہربائی کشش کہاں ہے۔ آپ نے یہ جملے اپنی طرف سے زاید کرلئے ہیں۔ کہ یوسف ڈرانے دھمکانے پر بھی قابو میں نہ آئے اور انھوں نے ہاتھ بھی کاٹ لئے تب بھی وہ نہ لچے اور انھیں ان کے تقدس پر تعجب ہوا؛

قرآن حکیم کے الفاظ کی بندش صاف ظاہر کر رہی ہے۔ کہ وہ اس قدر وقفے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ کہ انھوں نے لگاوٹ کی اور جب قابو نہ چلا، تو ہاتھ کاٹ ڈالے۔

ہاں آپ کا یہ اعتراض بجا ہے کہ یوسف کے حسن کے لئے ‟ملک کریم" کا لفظ غیر موزوں ہے، لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ اگر مرحوم آزاد کا یہ خیال درست ہے کہ نیچرل خیالات تمام دنیا کے تقریباً ایک جیسے ہیں تو پھر یہ مشکل بھی رفع ہوجاتی ہے۔ ہمارے یہاں اگر عورتوں کے حسن وجمال کی تعریف کی جائے تو انھیں پریوں سے اور بچوں یا نوجوانوں کے جمال کی تعریف کی جائے تو فرشتوں سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اور پھر اگر یہ تاویل آپ کو نہ بھادے تو اس کی ایک اور توجیہ بھی نہایت موزوں اور مناسب خیال کی جاسکتی ہے۔ یہ قاعدہ ہے کہ عشق میں ترازو کے ہر دو پلڑوں کا توازن رسوائی اور بدنامی میں قائم رکھا جاتا ہے۔ میری رسوائی پر اُن کو خوش نہ ہونا چاہئے قیس رسوا تھا تو کیا لیلیٰ کی رسوائی نہ تھی

زلیخا کی رسوائی کے ضمن میں یوسف کی جو رسوائی ہوئی تھی وہ بھی عورتوں کی اسی جماعت کی شرمندۂ احسان تھی جب وہ یوسف کے جمال سے اس قدر حیرت زدہ ہوئیں۔ کہ اللہ اکبر، انکی زبان سے نکل گیا۔ تو انھوں نے جھٹ اس الزام کی تردید بھی کر دی۔ جو بالواسطہ یوسف پر لگایا گیا تھا۔ یہاں بیشک آپ سوال کر سکتے ہیں کہ وہ اس قدر جلدی کیوں کر۔ یوسف کی خوبی اخلاق سے متاثر ہوگئیں حالانکہ یوسف کو وہاں آئے ہوئے ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا، میرے اس جواب کا تعلق نفسیات سے ہے۔ یہ قاعدہ ہے کہ جب ہم کسی شخص کے حسن وجمال یا رعب وجلال سے یوں فوری طور پر متاثر ہو جائیں تو ہمارے دل میں فوراً ان کی خیر خواہی اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں، اور ہم بالکل گوارا نہیں کر سکتے کہ اس شخص کے متعلق کسی قسم کے مضر خیال جب انھوں نے اس غیرتِ ناہید کو دیکھا۔ ان کے دلوں نے انھیں ملامت کی اور بے اختیار اُن کی زبان سے نکل گیا۔ حاشا للہ ما ہذا بشرا۔ مجھے اس پر بھی حیرت ہے کہ آپ زنانِ مصر کو زلیخا کے ساتھ شریک جرم قرار دے کر بھی یوسف کے جمال کی

تاثیر سے منکر ہیں۔ ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ یہ عورتیں خواہ یہ کوئی ہوں۔ اور کتنی ہوں ساری کی ساری زلیخا کے ساتھ شریک عشق ہیں۔ اگر وہ معمولی حسن و جمال کا مالک تھا۔ تو آخر ان واقعات کو عامۃ الوقوع ہونا چاہئے تھے۔ کیا وجہ ہے کہ ہماری زندگیاں ان رنگینیوں سے خالی نظر آتی ہیں اور حسرت جلوہ لب بام سے مرے جارہے ہیں۔ اے بسا ... زبکہ خاک شدہ۔ میرا خیال ہے کہ یہ عورتیں مجمع کی ضمیر نے بھی آپ کی کافی امداد کی ہے۔

یہ قدرتی امر ہے کہ جب یوسف کو زلیخا نے اس مجمع میں بلایا۔ تو یہ تو نہیں ہو سکتا۔ کہ وہ زنان مصر بہار خزاں دیدہ ہونگی۔ بلکہ عام سمجھ کی بات ہے۔ کہ ایسی محفلوں میں وہی نظارہ سوز ہوتی ہیں۔ جو دولت حسن کی مالک ہوں۔ یوسف کا ایسے مجمع میں بلانے سے زلیخا کا مطلب خواہ کچھ کیوں نہ ہو لیکن یوسف نے یہی سمجھا ہو گا۔ اس کم بخت نے پھانسنے کیلئے یہ گلدستہ ہائے رنگا رنگ جمع کئے ہیں۔ اور گو زنان مصر، اس وقت یہ جذبہ لیکر نہیں گئی تھیں لیکن یوسف کے آنے نے سارا نقشہ بدل دیا۔ اور نگاہوں نے غمازیاں کیں،

چنانچہ یہی خیال اس کے دل میں رہا۔ اور آخر اس نے بادشاہ مصر سے کہدیا۔ کہ مابال النسوۃ التی قطعن ایدیھن علاوہ ازیں زنان مصر کا یہ جلسہ کیا رسوائے عالم نہ ہوا ہو گا۔ اور کیا عوام اس سلسلہ میں یوسف سے بھی بدظن نہوئے ہونگے اور پھر اُس کی قید نے اس کی تائید نہ کر دی ہو گی۔ یہ وہ جوابات تھے جن کے ماتحت یوسف کو اپنی برائت کے لئے ان عورتوں کا ذکر کرنا پڑا۔

(نگار) گزشتہ ماہ کے رسالہ میں "حسن یوسف" کے متعلق میرے اظہار خیال پر آخر کار بعض "حسن پرست" طبیعتیں بے چین ہو ہی گئیں اور اُن کو گوارا نہ ہوا کہ "مذہبی جمالیات" پر کسی قسم کی تنقید کیجائے میرے مضمون کے رد میں متعدد تحریریں وصول ہوئیں، جن میں صرف دو درج کی جاتی ہیں۔ باقی تحریریں چونکہ ان سے بھی زیادہ "حسن استدلال" رکھتی تھیں اور جن میں "نسائیت" کے صرف اُس حربہ سے کام لیا گیا تھا جسے گالی۔ کوسنا کہتے ہیں اور جس کے سامنے ایک مرد کو سپر ڈالدینا ہی پڑتی ہے اس لئے اُن کو درج کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ مجھے افسوس ہے اور تھوڑی سی حیرت بھی کہ نہ فاضل فرنگی محلی نے میرے مقالہ کو غور سے پڑھا اور نہ مولوی غلام ربانی صاحب نے ——— میں نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ حضرت یوسف حسین نہیں ہو سکتے تھے یا یہ کہ اُن کے جمیل ہونے میں کوئی استحالۂ عقلی ہے بلکہ مدعا صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ کلام مجید سے ان کا جمیل ہونا اور ایسا جمیل ہونا کہ اُسے "عطایائے نبوت" یا "معجزات خداوندی" میں شمار کیا جائے کسی طرح ثابت نہیں ہوتا۔ پھر جس رسوخ کے ساتھ اس سے قبل میں اس خیال پر قائم تھا، اسی طرح اب بھی ہوں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان دونوں حضرات کی تاویلیں کیونکر اُس صداقت کو محو کر سکتی ہیں جو یقیناً "حسن یوسف" کے افسانہ

سے زیادہ حقیقت رکھتی ہے۔

میں جواب کے دو پہلو اپنے پاس رکھتا ہوں ایک تو یہ کہ ان حضرات نے جو تاویلیں کلام مجید سے حسن یوسف کے ثابت کرنے کے لئے ایداع کی ہیں اُن کی حقیقت کو واضح کر دوں اور دوسرے یہ کہ اِن سب کو نظر انداز کر کے ایک اصولی بحث کے ذریعہ سے یہ بتا دوں کہ حضرت یوسف کے جمال کو معجزہ قرار دینا عقلاً محال ہے اور عملاً عبث وبیکار۔ میں اس بحث پر زیادہ صفحات لینا مناسب نہیں سمجھتا لیکن چونکہ اس کے بعد مجھے اس موضوع پر کچھ لکھنا بھی نہیں ہے اس لئے میں کوشش کرونگا کہ جو کچھ مجھے کہنا ہے مختصراً اسی اشاعت میں عرض کر دوں اور بحث کے دونوں پہلوؤں کو پیش کر کے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاؤں۔ پہلے میں اپنے حریفوں کے جواب پر تنقید کرتا ہوں۔

فاضل فرنگی محلی فرماتے ہیں کہ برادران یوسف جانتے تھے کہ یعقوب علیہ السلام یوسف اور بینامن سے زیادہ محبت کرتے ہیں اور یعقوب کی محبت اس بنا پر تھی کہ وہ ذریعہ وحی معلوم کر چکے تھے کہ یہ دونوں بھائی نبوت کے لئے منتخب ہو چکے تھے پھر چونکہ برادران یوسف اس محبت کی بنا پر دونوں بھائیوں سے جلتے تھے اس لئے چاہئے تھا کہ وہ دونوں کو ہلاک کرتے، لیکن انھوں نے صرف یوسف کو کنوئیں میں ڈالا کیونکہ وہ بہت جمیل تھے۔

اس کا جواب بہت مختصر ہے اور وہ یہ کہ جب یعقوب کی محبت یوسف اور بینامن سے اس بنا پر تھی کہ وہ ان کے آئندہ مدارج سے ذریعۂ وحی آگاہ ہو گئے تھے، جیسا کہ خود فاضل فرنگی محلی نے ارشاد فرمایا ہے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ یعقوب کو یوسف ہی سے زیادہ محبت رہی ہوگی کیونکہ نبوت تو یوسف ہی کی قسمت میں لکھی تھی نہ کہ بینامن کے لئے (فاضل فرنگی محلی نے بینامن کو بھی پیغمبر بتایا ہے مجھے نہیں معلوم کہ وہ کس قوم کے لئے نبی مبعوث ہوئے تھے) اور اگر بینامن کو بھی تھوڑی دیر کے لئے نبی مان لیا جائے تو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ یوسف کے مرتبہ کے نبی نہ تھے اور اس لئے یقیناً یعقوب، یوسف ہی سے زیادہ محبت کرتے ہوں گے اور اسی بنا پر برادران یوسف نے یوسف ہی کو ہلاک کرنا چاہا۔ حسن وجمال کو وجہ قرار دینا ایک ایسی تاویل ہے جس کی تردید خود فاضل فرنگی محلی کے قول سے ہوتی ہے

دوسرا استدلال یہ پیش کیا گیا ہے قافلہ والوں کا یوسف کو کنوئیں میں دیکھ کر "یا بشریٰ" کہنا ہی ثابت کرتا ہے کہ آپ بہت خوبصورت تھے۔ "یا بشریٰ" کے بعد بیان حسن وجمال کی ضرورت نہیں رہتی۔

میں یہ کسی طرح ماننے کے لئے تیار نہیں کہ "یا بشریٰ" کا لفظ اس قدر حاوی وجامع ہے کہ اس کے ساتھ بیان حسن وجمال کی ضرورت نہیں رہتی۔ لفظ بشریٰ کے معنے صرف بشارت اور خوشخبری کے ہیں، اور کلام مجید میں جہاں کہیں یہ لفظ مستعمل ہوا ہے اسی معنی میں ہوا ہے، کہیں بھی حسن وجمال کا مفہوم شامل نہیں ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ خاص اس موقع پر یہ معنی متبادر ہیں تو اس کے لئے پہلے حسن وجمال کو ثابت کرنا چاہئے تھا نہ کہ اسی کے ذریعہ سے اس کو ثابت کرنا۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ اس زمانہ میں چونکہ لونڈی غلام کے خرید وفروخت کا رواج کثرت سے تھا اور یہ قافلہ بھی یہی کاروبار کرتا تھا اس لئے جب ایک آدمی نے کنوئیں کے اندر ڈول ڈالا تو دیکھا

کہ اندر ایک لڑکا پڑا ہوا ہے اور اس نے اسی وقت اہل قافلہ کو پکار کر کہا کہ "مبارک ہو، کنویں کے اندر ایک لڑکا بھی مل گیا"۔ یعنی ایک مال اور ہات آیا۔ جیسا کہ آگے کی آیت سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ "واسروہ بضاعۃ" (یعنی اس کو بھی مال تجارت سمجھ کر چھپا لیا) ڈول ڈالنے کے ساتھ ہی اس کا یہ کہنا صاف طور پر ظاہر کرتا ہے کہ اس کا مبارکباد دینا صرف اسی بنا پر تھا ورنہ کنویں کے اندر پہلی نگاہ میں وہ حسن یوسفی کی حقیقت کیا معلوم کر سکتا تھا۔ اگر یوسف واقعی غیر معمولی جمیل ہوتے تو صرف "اسروہ بضاعۃ" نہ کہا جاتا بلکہ اسی کے ساتھ ایسے الفاظ بھی ضرور ہوتے جن سے یہ خصوصیت ظاہر ہوتی۔ اس امر کا ثبوت کہ حضرت یوسف غیر معمولی جمیل نہ تھے بعد کی اس آیت سے بھی ملتا ہے۔ "وشروہ بثمن بخس دراہم معدودۃ" یعنی اہل قافلہ نے یوسف کو نہایت کم قیمت پر چند درہموں کے عوض فروخت کر دیا۔ اگر یوسف غیر معمولی جمیل ہوتے تو ظاہر ہے کہ اہل قافلہ جو یہی کاروبار کرتے تھے کبھی ایسے "بدیعۂ حسن و جمال" کو اس قدر ارزاں نہ دیدیتے

فاضل فرنگی محلی نے "لما بلغ اشدہ آتیناہ حکماء علما" کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے اشد کے معنے انتہائی مصائب کے لئے ہیں۔ معلوم نہیں مجھے اس اختراع پر فرنگی محل کے نصاب تعلیم کو مبارکباد دینا چاہئے یا جناب فخر عالم صاحب کی قوت فکر کو سراہنا چاہئے۔ اگر وہ شدہ کی ضمیر پر غور کر کے اس کا مرجع تلاش کرنے کی زحمت گوارا کرتے تو انہیں خود معلوم ہو جاتا کہ وہ کیا کہ رہے ہیں۔ خیر اسی سلسلہ میں وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس آیت میں خدا نے علم و حکمت کے ساتھ ساتھ، عطائے جمال کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ وہ تو خدا ان کو پہلے ہی دے چکا تھا" حالانکہ اگر میں ان سے پوچھ بیٹھوں کہ کلام مجید کی کس آیت سے وہ اس کو ثابت کر سکتے ہیں۔ تو ان کے پاس سکوت کے سوا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ اگر اس کی صراحت کسی جگہ ہوتی پھر نزاع ہی کیا تھا۔ ایک ایسی شے کو دلیل میں پیش کرنا جو خود معرض بحث میں ہے طرفہ طرز استدلال ہے۔

اس کے بعد وہ اصل گفتگو آتی ہے جس پر جمال یوسفی کے تصدیق کا انحصار ہے۔ یعنی زلیخا کا فریفتہ ہو جانا اور عورتوں کا آپ کو دیکھ کر بجائے پھلوں کے ہاتھ کاٹ لینا۔ چونکہ اس باب میں اپنے خیالات فروری کے رسالہ میں ظاہر کر چکا ہوں اس لئے ان کی تکرار مناسب نہیں معلوم ہوتی آج میں بحث کا دوسرا پہلو اختیار کرونگا۔

اس سلسلہ میں جو باتیں جمال یوسفی کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں ان میں سے اہم ترین یہ ہیں:۔

(۱) زلیخا حضرت یوسف پر عاشق ہوئی اور بقول فاضل فرنگی محلی "عورتوں کے عشق کا مدار ہی حسن ظاہری پر ہے"

(۲) بعض زنان مصر کا یوسف کو دیکھ کر بجائے پھلوں کے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ ان کے حسن و جمال سے مسحور ہو گئیں

امر اول کے متعلق مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ محبت کا سبب فقط حسن ظاہری کو قرار دینا اس لحاظ سے تو درست ہے کہ چاہنے والے کی نگاہ میں محبوب خواہ وہ کیسا ہی ہو جمیل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ کلیہ کہ الفت کا سبب ہمیشہ حسن محض ہوا کرتا ہے، بالکل غلط ہے دنیا میں ہزاروں واقعات ایسے پیش کئے جا سکتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض نہایت جمیل عورتوں نے ایسے مردوں سے محبت کی جو نہ صرف یہ کہ حسین

نہ تھے بلکہ واقعی بدشکل تھے۔

امر دوم کے متعلق یہ دیکھنا ہے کہ زنان مصر نے یوسف کو دعوت سے قبل دیکھا تھا یا نہیں، اگر دیکھا تھا تو اُسوقت بھی کیوں ان سے ایسی ہی کوئی حرکت مسحوری کی سرزد نہیں ہوئی۔ اور اگر انھوں نے دعوت ہی کے موقعہ پہ اول اول دیکھا تھا تو کیا سبب ہے کہ ان پر تو یہ اثر ہوا اور زلیخا پر جو حقیقتاً نہایت شغف رکھتی تھی نہ دعوت کے وقت نہ اس سے قبل کوئی اثر اس قسم کا ہوا۔ کم از کم ایک بار اگر زلیخا بیہوش ہی ہو جاتی تو بھی کہا جاتا کہ وہ تو یوسف کا حسن ہی ایسا تھا۔

اگر یوسف کا حسن اعجاز کی حد تک پہونچا ہوا تھا اور موسیٰ کے ید بیضا کی طرح وہ بھی ایک معجزہ تھا تو، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ معجزہ آپ کو اُس وقت کے تمام اہل عالم کے مقابلہ میں دیا گیا تھا یا صرف مصر والوں کے مقابلہ میں ظاہر ہے کہ تمام اہل عالم کے لئے نہ تھا کیونکہ حسن و جمال کا معیار بالکل مختلف ہے اور ہر قوم و ملک کا معیار جدا ہوتا ہے، اس لئے لامحالہ یہی ماننا پڑے گا کہ مصر والوں کے لئے معجزہ تھا۔ لیکن اس کی ضرورت اُسی وقت ہوتی جب اہل مصر کو اپنے حسن پر ناز ہوتا، حالانکہ یہ نہ تاریخ سے ثابت ہے نہ قرآن سے اسی کے ساتھ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ حسن یوسفی کے معجزہ سے کیا نتیجہ برآمد ہوا اور اس نے اصلاح قوم کی کیا خدمت انجام دی اور اگر اس معجزہ سے مقصود اصلاح اخلاق نہ تھا بلکہ صرف ایک کامل و مسحور کن نمونۂ جمال پیش کرنا تھا، تو چاہئے تھا کہ جو شخص آپ کو دیکھتا فریفتہ ہو جاتا، حالانکہ یہ بالکل خلاف واقعہ ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ آپ کا حُسن کوئی معجزہ نہ تھا تو پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے غیر معجز حسن کے ہوتے ہوئے، تمام اسوۂ یوسفی کو چھوڑ کر صرف اسی کا افسانہ کیوں بار بار دہرایا جاتا ہے اور کیوں ایسی غیر مہتم بالشان چیز کا ذکر قرآن پاک میں پایا جائے۔

فاضل فرنگی محلی نے سلسلۂ گفتگو میں دو حدیثوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ میرا موضوع چونکہ احادیث سے بحث کرنا نہیں تھا اس لئے میں اس وقت بھی احتراز کرتا ہوں۔ تاہم یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جس وقت ان احادیث کی حقیقت پر بحث کی جائے گی تو ان سے وہی نتیجہ نکلے گا جو کلام مجید کے آیات پر غور کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔

میرے نزدیک وہ حدیث جس میں رسول اللہ نے اپنی اور یوسف کے حسن کا فرق بتایا ہے۔ ساقط الاعتبار ہے اسی طرح وہ حدیث جس میں بتایا گیا ہے کہ شب معراج میں آپ نے یوسف کو "کالقمر لیلۃ البدر" دیکھا، بہت کچھ محل نظر ہے۔

مولوی غلام ربانی صاحب عزیز نے چونکہ اپنے مضمون میں زیادہ تر شاعری سے کام لیا ہے اور شاعری بھی وہ جس کو میں پورے طور پر نہیں سمجھ سکا اس لئے جواب دینے سے معذور ہوں تاہم مجھے یقین ہے کہ انکی ایرادات کا بھی جواب اس میں آگیا ہوگا۔

فاضل فرنگی محلی نے ایک غلطی اور کی ہے، اس کو بھی دور کر دینا مناسب سمجھتا ہوں اور وہ یہ کہ انھوں نے عزیز مصر کو جس نے یوسف کو متبنیٰ کیا تھا اور شاہ مصر کو جس نے یوسف کو قید خانہ سے طلب کیا تھا۔ ایک ہی ہستی قرار دیا ہے۔ حالانکہ عزیز مصر اور تھا

اور شاہ مصر اور مصر کے بادشاہ کا لقب عزیز نہ تھا، بلکہ فرعون، چنانچہ اس وقت مصر کا فرعون یا بادشاہ ریان بن ولید بن دومع تھا۔ اور جس شخص نے یوسف کو خرید کر کے متبنیٰ کیا تھا اس کا نام اطفیر یا قطفیر تھا جسے انگریزی میں (Potiphar) کہتے ہیں اور عزیز مصر کے لقب سے مشہور تھا۔ (ملاحظہ ہو ابن خلدون، تاریخ کامل وغیرہ)

نیاز

گارنٹی ۵ سال

۱۴ کیرٹ گولڈ پلیٹیڈ رسٹ واچ اپنی خوبی میں پچاس روپے کی گھڑی سے مقابلہ کرتی ہے ہر موسم میں سچا ٹائم بتاتی ہے۔ کاریگر کو اس کی مشین پر بہت ناز ہے۔ از حد خوبصورت و بہت پائدار ہے۔ کاریگری کی جدید ساخت ہے اس وجہ سے قیمت کم ہے۔ علاوہ محصول وغیرہ دمعہ، سات روپیہ۔

ٹیٹنل لیور واچ

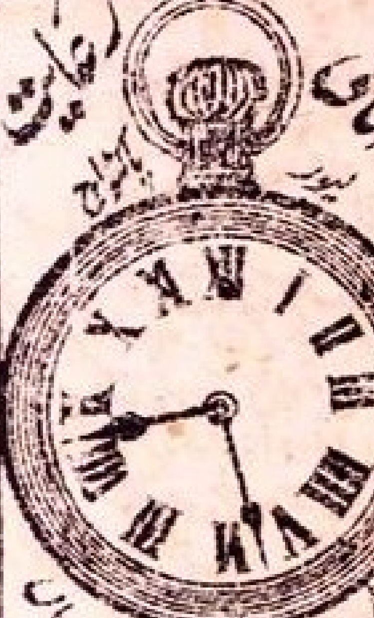

گارنٹی ۳ سال

نکل سلور کیس کی یہ گھڑیاں وقت کی سچائی میں کافی شہرت پا چکی ہیں۔ مگر میساد کا بیزہ گھٹنا بھی نہیں جانتیں ہمیشہ اپنا کام وفاداری کرتی ہیں قیمت علاوہ محصول وغیرہ دلعہ پانچ روپے

گھڑی کا چوکیدار		گارنٹی ۳ سال

الارم کی گھنٹی اس قدر زبردست ہو کر گھر والوں کے ساتھ ہمسایہ بھی بیدار ہو جاتے ہیں۔ وقت کی سچائی میں ہزاروں سندیں پا چکا ہے۔ کیونکہ کاریگر نے اس کی مشین نرالی قسم کی بنائی ہے۔ اس کے چلنے کے تین سال تک کے تو ہم ذمہ دار ہیں۔
قیمت علاوہ محصول وغیرہ تین روپیہ آٹھ آنہ (نیو کمپنین اینڈ کو دہلی سے منگائیے)

تینوں گھڑیاں صرف نو روپے (دلعہ) میں

دوسری جگہ یہی گھڑیاں دس روپیہ آٹھ آنہ میں ملتی ہیں!
ان تینوں گھڑیوں کی اصلی قیمت بلکہ سینڈرڈ سترہ روپے آٹھ آنہ ہوتی ہے لیکن ہم ہول سیل ڈیلر (تھوک فروش) ہیں بدیں وجہ ان خریداروں کو جو تینوں گھڑیاں یکدم طلب کرینگے نو روپے میں روانہ کرینگے اور محصول ڈاک و پیکنگ کا صرف بھی ہمارے ذمہ ہوگا۔ ایک یا دو گھڑی کے لئے کوئی رعایت نہیں۔
ایک مرتبہ آپ ہمارے سے معاملہ کیجئے پھر آپ ہمیشہ کیلئے ہمارے گاہک ہو جائینگے

ملنے کا پتہ نیو کمپنین اینڈ کو واچ کلاک مرچنٹس بازار چاندنی چوک نمبر ۸۰ دہلی

بھاگلپوری ٹسری ریشمی صافے

ٹسری اور ریشمی صافے یا تھان برائے کوٹ، قمیص، شیروانی، اعلیٰ درجے کے درکار ہیں تو ہمارے یہاں سے منگاکر استعمال میں لائیے:-

مولوی کبیر احمد خاں برادرز بھاگلپور سٹی

ہمالیہ سے دو دو باتیں

بھلا مجال کہاں مجھ سے بے زبانوں کی   کہ منہ سے بات کہوں کچھ فلک نشانوں کی
ترے وجود سے علم یہ ہو گیا روشن   کہ خاکِ ہند میں رفعت ہے آسمانوں کی
نہ بھول ہیں تری دامن میں سامنے جن کے   بہار گرد ہے دنیا کے گلستانوں کی
گپھاؤں سے تری نکلیں تو سارے عالم میں   صدائیں گونج اٹھیں توحید کے ترانوں کی
بلندیوں سے تری وہ رواں ہوئے چشمے   حیات جن سے ہے دنیا کے باغبانوں کی
ہے مجاز میں جو نشۂ حقیقت ہے   وہ یادگار ہے تو عشق کے فسانوں کی
تری بلندی عز و وقار کے آگے   چلی نہ ایک ہوائی جہاز رانوں کی
یہ خامشی یہ بلندی یہ عز و شان ثبات   تو ہی قدیم نشانی ہے بے نشانوں کی
وہ صور پھونک دے اپنے لب مبارک سے   کہ یاد تازہ ہو بھولے ہوئے فسانوں کی

اٹل ہوں جیسے ارادے خیال جیسے بلند
اٹھیں اب ایسے زمین وطن سے حوصلہ مند

ازل کے روز ستم کا یہ بندوبست ہوا   کوئی بلند ہوا اور کوئی پست ہوا
اگر فقیر کی قسمت میں بوریا آیا   تو شاہ کے لئے مسند کا بندوبست ہوا
کسی کا دل نہ بھرا تاج و گنج لیکر بھی   کسی کے ہات جو کلی لگی تو مست ہوا
کسی کی رفعتِ ہمت سے تو بھی نیچا ہے   کوئی وہ ہے کہ خود اپنی نظر میں پست ہوا
خودی یہ غالب و زردار و بامراد مٹے   ضعیف و بیکس و مسکیں خدا پرست ہوا
امیدِ خلد پہ سنیاس کوئی لے بیٹھا   شراب ناب لنڈھائی کسی نے مست ہوا
وفورِ غم سے کوئی زندگی سے عاجز ہے   کسی کا عیش بڑھا یہ کہ خود پرست ہوا
رہ نیاز میں کوئی ہے پائمالِ جہاں   تفنگ و توپ کوئی لیکے چیرہ دست ہوا
غلام ساقیِ باطن کہیں پہ شیدا ہے   خراب بادۂ ظاہر مکان پرست ہوا

زمانہ میں کوئی اک حال پر رہا ہی نہیں
ہماری ذلت و پستی کی انتہا ہی نہیں

نہ ہوتا آج حمایت پہ تو اگر اپنی   نہ بھول بیٹھتے راحت میں ہم خبر اپنی
جہاں پہاڑ ہیں لاشیں وہاں نظر آتیں   بناتے خوق سے سینوں کو ہم سپر اپنی
خیالِ زیست رہ اتحاد بن جاتا   نفاقِ قوم سے بنتی نہ جان پر اپنی
رگوں میں خون سروں میں جنون چڑھ جاتا   پناہ دیتی ہمیں قوتِ جگر اپنی
بلندیاں تری ہوتیں نہ سد راہ اگر   تو گھوم پھر کے نہ رہتی نہیں نظر اپنی
مثالِ موجِ ہوا ہم رواں دواں پھرتے   بساط پھیلتی سارے جہان پر اپنی
جہان بھر کی حمایت پہ ہم تلے ہوتے   جو ہوتی ہات میں تلوار اور سپر اپنی
نکل کے گھر سے جنھوں نے کیا جہاں بیدار   نہ دے سکے وہ سلف ہمکو کچھ خبر اپنی
تو ہی تو مانعِ الطافِ آسمانی ہے   ترے سبب سے ہے فریاد بے اثر اپنی

اگر بڑا ہے تو چھوٹوں کی بات بھی سن لے
کسی کا قصۂ دردِ حیات بھی سن لے

ہوا ہے تجھ کو اگر قربِ آسماں حاصل   تو بیکسوں کی نہ فریادِ غم میں ہو حائل
کسی کے رنج سے پانی نہ ہو تو کیا ہے جگر   کسی کے غم پہ نہ روئے لہو تو کیا ہے دل
نباہنا حقِ ہمسائگی اگر ہے تجھے   ہمارے ساتھ تڑپ تو بھی صورتِ بسمل
ہلا کے سنگ جگر ناخنوں سے کر گھائل   رگوں سے خون کے دریا بہا کے دکھلا دے
یہی ہے فرض یہی اقتضا مروت کا   دکھا دے عرش پہ تو چیر کر ہمارا دل
رگوں کو کاٹ کے ایک ایک نشان دکھلا دے   جہاں جہاں ہے وہ زخمی جہاں جہاں گھائل
بیان قصۂ غم ہو رقیب صبر و قرار   فغانِ درد سے ہل جائیں قدسیوں کے دل

تڑپ تڑپ کے نہ آہوں سے چین لینے دے | کرم پہ اپنے نہ جب تک کہ عرش ہو مائل
جو یہ نہیں تو سرک جا نظر کے آگے سے
دعا کا وقت ہے ہٹ جا جگر کے آگے سے

جواب ہمالیہ

ہمالیہ نے سنا جب یہ دلخراش کلام | بھر آئے دیدۂ پُرنم میں اشکِ لالہ فام
اک آہ سرد بھری اور یوں ہوا گویا | عبث کیا ہے مجھے تو نے موردِ الزام
محب و محسن و ہمدرد و دستگیر و شفیق | زیادہ مجھ سے کوئی ہند کا ہے تو دے نام
ازل کے دن میں نے جو انجام ہند دیکھ لیا | نہ پوچھ مجھ سے کہ واقف ہیں سب خواص و عوام
عذابِ ہند سے آٹھوں پہر تڑپتا ہوں | تب درد دل سے یہ سینہ ہے محشر آلام
وہ غم ہے اُف کہ کلیجے میں پڑ گئے ناسور | رواں ہے دیدۂ پُرنم سے سیل اشک مدام
فلک کی سمت ہے رخ ایک پاؤں پر ہوں کھڑا | یہی دعا ہے شب و روز اور صبح و شام
رحیم رحم کہ ہندی بھی تیرے بندے ہیں | زمانہ ہو گیا سہتے ہوئے انھیں آلام
بڑے ہوئے ہیں غریبوں کی جان کے لالے | ستائے دیتی ہے اب انکو گردشِ ایام
دکھا دے شانِ کرم جلد اے غفور و رحیم | مٹا دے اُن کے ستارے سے کلفتِ ایام
وہاں سے آتی ہے رہ رہ کے آہ یہ آواز | بھلا دیا ہے ترے ہند نے ہمارا پیام
اُٹھا کے رکھا ہے دیدوں کو طاقِ نسیاں پر | فسانہ کر دئے گیتا نے پاک کے احکام
تمام قوم وہ آداب بھول بیٹھی ہے | کبھی تھا جن سے یہ خطہ ہی قدسیوں کا مقام
نہ نام ہے کہیں اخلاق کا نہ ایماں کا | نہ حوصلے نہ کہیں حوصلوں میں ہے کچھ کام
نہ دل میں بوئے وفا ہے نہ پاس غیرت ہے | نہ رنگ چہرے پہ اپنا ہے اور نہ اپنا نام
قدیم رنگ محبت سے شرم آتی ہے | نئے بتوں کے ہیں بندے نئی ادا کے غلام
جگر میں درد نہ سینوں میں جوش ہے باقی | پیا ہے بادۂ تہذیب نو کا جب سے جام
کچھ اس طرح مئے پندار کے ہیں متوالے | کہ ایک بھائی کا چھونا ہے دوسرے کو حرام
بٹے ہیں ایک سے یہ صد ہزار قوموں میں | تو ہی بتا دے کہ کیا ہے نفاق کا انجام
کہیں بھی ان میں رہی بوئے قومیت باقی | غلط ہے دی جو انھیں کوئی ہندیوں کا نام
مگر وہ غیرت و عصمت کی دیویاں جن سے | وفائے ہند کو حاصل ہوئی حیاتِ دوام
انھیں کی فرض شناسی نہیں بچا ہے | وگرنہ مٹ گیا ہوتا جہاں سے انکا نام
اگر ہے پاس تجھے انکی زندگانی کا | تو جا کے دے مری جانب سے تو نہیں پیام

جہاں ہے دین وہیں عیش کامرانی ہے
وہیں بقا ہے وہیں فیض آسمانی ہے

جگر بریلوی

زنان بازاری

کی پر اسرار زندگی کے متعلق چھ عجیب و غریب ناول

سعیدہ۔ ایک تعلیم یافتہ نوجوان اور ایک بازاری کے جذبات کا بہترین خاکہ انجام اخلاقی فلاح پر کیا گیا ہے قیمت .... عہ
شاہد رعنا۔ دہلی کی ایک ذیرہ دار طوائف کی خود نوشت سوانح عمری ہے کمسنی سے لیکر بڑھاپے تک کے حالات مکر و فریب کی داستان آپ بیتی کی صورت میں عجیب لطف پیدا کرتی ہے عہ
انجام عیش۔ بدکاری اور آوارگی کے مختلف پہلو قصہ کی صورت میں اس قدر تکمیل کے ساتھ دکھائے گئے ہیں کہ کسی دوسری جگہ نظر نہیں آ سکتے۔ سوسائٹی کی اصلاح کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے قیمت ۱۱ر

سعادت۔ دہلی کی ایک تعلیم یافتہ سلیقہ مند خوبصورت طوائف کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور عاشقانہ خط و کتابت اور وصل و فراق کے کیفیات کو عجیب انداز سے بیان کیا ہے قیمت ۸ر
سزائے عیش۔ فلسفہ حسن و عشق اور تفریحات عامہ پر عجیب و غریب کتاب ہے اس میں ایک شریف گھر اور ایک طوائف کے دنیات کا نتائج تقابل کا نقشہ دکھایا گیا ہے قیمت ۱ر
سراب عیش۔ طوائف سے نکاح کر کے ان کو بہو بیٹیوں میں لا کر رکھنے کے نتائج پر روشنی ڈالی گئی ہے قیمت ۱ر

منیجر نگار بک ڈپو نظیر آباد لکھنؤ

ترانہ!

(ضحاک کے قتل اور فریدون کی تخت نشینی پر!)

ڈراما ضحاک کا آخری ورق

ساقیا!

بادۂ گلگوں بیار ——! ساقیا!

ظلم کی تاریکیاں مرجھاگئیں! عدل کی رنگینیاں پھر چھاگئیں!

عیش و راحت کی ہوائیں آگئیں!

آگئیں! —— چھاگیا ابر بہار! —— ساقیا!

ساقیا! —— بادۂ گلگوں بیار! —— ساقیا!

ساقیا! ——!

جنکے ہنگاموں سے کانپ اُٹھتے تھے ہفت افلاک بھی! کچھ نشاں ملتا نہیں آج انکا زیر خاک بھی

ظلم و ظالم کا نتیجہ کتنا عبرت خیز ہے!!!! ظلم بھی خاموش ہے! اور ظالم ناپاک بھی

—— ظلم کی تاریکیاں مرجھاگئیں! عدل کی رنگینیاں پھر چھاگئیں! ——

عیش و راحت کی ہوائیں آگئیں!

آگئیں! —— آگئی فصل بہار! —— ساقیا!

ساقیا! —— بادۂ گلگوں بیار! —— ساقیا!

ساقیا ——!

صبر کر! مظلوم! جور بیکراں پر صبر کر! آفت و رنج و بلائے ناگہاں پر صبر کر!

گردش ایام و دور آسماں پر صبر کر! صبر کو محبوب رکھتا ہے خدائے پاک بھی!!

—— ظلم کی تاریکیاں مرجھاگئیں! عدل کی رنگینیاں پھر چھاگئیں ——

عیش وراحت کی ہوائیں آگئیں !

آگئیں !ــــ باغ ہیں گل درکنار !ــــ ساقیا!

ساقیا !ــــ بادۂ گلگوں بیار !ــــ ساقیا!

ساقیاــــ !

عدل سے آباد ہے یہ کارگہ غافل نہ ہو ! عقل ہے سر میں، تو ظلم وجور پر مائل نہ ہو!

عدل سے بے کام ! محو فکر بے حاصل نہ ہو ! عدل کے قدموں پہ ہیں محو سجود افلاک بھی !

ــــ ظلم کی تاریکیاں مرجھا گئیں ! عدل کی رنگینیاں پھر چھا گئیں ــــ

عیش وراحت کی ہوائیں آگئیں !

آگئیں !ــــ ہیں فضائیں مشکبار !ــــ ساقیا!

ساقیا !ــــ بادۂ گلگوں بیار !ــــ ساقیا!

ساقیاــــ !

جشن نوروزی ہے برپا گل فضائیں شادہیں ! باغ ہیں سرمست ! باغوں کی ہوائیں شادہیں !

ساری دنیا خوش ہے ! دنیا کی ادائیں شادہیں ! شاد ہے بندوں سے آج اپنے خدائے پاک بھی !

ــــ ظلم کی تاریکیاں مرجھا گئیں ! عدل کی رنگینیاں پھر چھا گئیں !ــــ

عیش وعشرت کی ہوائیں آگئیں !

آگئیں !ــــ مہرباں ہے کردگار !ــــ ساقیا!

ساقیا !ــــ بادۂ گلگوں بیار !ــــ ساقیا!

ساقیاــــ !

ساقیاــــ !

اختر شیرانی

ضرورت ہے اگر آپ کو خیمے اور دریاں اور حربی ساماں کی ضرورت ہو تو فوراً ہمیں ایک کارڈ لکھئے ہمارے ہاں ہر قسم کا سامان نہایت ارزاں ملتا ہے والی ریاست بڑے بڑے روسا ہمارے ہی یہاں سے مال منگاتے ہیں۔ فہرست اردو یا انگریزی کی منگاکر ملاحظہ فرمائیے ہمارا کارخانہ صداقت کی وجہ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہو گیا ہے۔ محمد حسین اینڈ گورنمنٹ مرچنٹ فتح گڑھ یو۔ پی

مصطلحاتِ امیں

دل کے پیمانے کو خمخانہ کہا کرتا ہوں　　میں شجر کو عملِ دانہ کہا کرتا ہوں
ذرہ ذرہ ہے نگاہوں میں مری حسن کی شمع　　دلِ بیتاب کو پروانہ کہا کرتا ہوں
میرے نزدیک تصور ہے حریمِ کعبہ　　میں تخیل کو صنمخانہ کہا کرتا ہوں
الجھنیں میری طبیعت کی نکالیں اس نے　　زلفِ پر پیچ کو میں شانہ کہا کرتا ہوں
بیخودی میں جو کبھی یادِ خودی آتی ہے　　اس کو میں نعرۂ مستانہ کہا کرتا ہوں
سیر چشمی ہے نگاہوں میں مری عقلِ سلیم　　بندۂ زر کو میں دیوانہ کہا کرتا ہوں

ہے مواخات امیں جن کی غرض پر مبنی
ان یگانوں کو میں بیگانہ کہا کرتا ہوں

امین حزیں

دورِ جدید کا آغاز

وطن کی خاک سے ہونے کو ہے اک آسماں پیدا　　چمک اے ذرۂ دل، کر شعاعِ ضو فشاں پیدا
نظامِ دہر کی گردش میں فرق آیا ہے مدت میں　　نئے سیارے ہونگے اب بشکلِ کارواں پیدا
شہیدانِ وطن کے دل شگوفے بنکے پھوٹینگے　　لہو سے قومیت کے ہوگا حسنِ گلستاں پیدا
یہ رنگ و نسل کی تفریق مٹجائیگی دنیا سے　　کریگی دیر کی مٹی حرم کے پاسباں پیدا
فضائے خلد کا پرتو پڑیگا دشتِ عالم پر　　کرینگے خارِ صحرا نکہتِ باغِ جناں پیدا
عداوت کے شرر کو موجِ حریت دبا دیگی　　شعاعِ برق سے ہونگی چمن کی پتیاں پیدا
جہاں میں انقلاب آئیگا قسمت کھائیگی پلٹا　　اب اس خاکِ غلامی ہی سے ہونگے حکمراں پیدا

مری چشمِ تجسس میں وہ عالم آشکارا ہے
کہ جس کے ذرہ ذرہ سے ہے حسنِ جاوداں پیدا

محمود اسرائیلی

چاند اور ہم

چاندنی افسردہ بھی ہے زرد بھی
اُٹھ رہا ہے ہلکا ہلکا درد بھی

....

کچھ پریشانی ہے ایسی ماہ میں
جیسے کھو جائے مسافر راہ میں

چاندنی میں کوئی شے بیتاب ہے
حسن کا شاید پریشاں خواب ہے

چاند ہے اشکوں سے منہ دھوئے ہوئے
نغمے غم انگیز ہیں سوئے ہوئے

بے سکوں ہے آج کچھ آشفتہ حال
یا تڑپ کے بعد ہے کوئی نڈھال

خامشی جو ہمرہِ مہتاب ہے
بولنے کے واسطے بیتاب ہے

چاندنی کا حسن اس کے دم کو ہے
اور محبت اُسکو افسرہم سے ہے

حامد اللہ افسر

لحد کی پہلی شب

اور

سروشِ عبرت کی آواز

ہوش کب آیا تجھے اے مستِ کیفِ جامِ عیش
آگیا جب آفتابِ زیست زیرِ بامِ عیش

تجھکو جو کنجِ لحد میں کچھ نظر آتا نہیں
چھپ گیا ہے عیش کا دن ہو چکی ہے شامِ عیش

بند اب کبتک رکھے گا دیدۂ عبرت نگاہ
کھول دے اس کو کہ آخر ہے یہی انجامِ عیش

مار دکر دم بنگئے ہیں تعبرِ مرقد میں تجھے
ذکرِ عیش و یادِ عیش و فکرِ عیش و نامِ عیش

تو ہے جب تک تیرے پیکر کو ہے چھٹکارا محال
اب قفس میں آگیا، ٹوٹا جو تارِ دامِ عیش

زیست کی دولت تھی جب تک، تھی مسرت کی پکار
بھول کر بھی اب ادھر آتا نہیں پیغامِ عیش

زندگانی نشہ تھی جب رات دن تیرے لئے
تجھکو کیوں معلوم ہوتا کب گئے ایامِ عیش

وقت جب ہے جاگنے کا سو کے کٹتا ہے کہیں
وقت جب سونے کا آیا تجھکو نیند آتی نہیں

ہاں سن اے مفلس فراوانیٔ دولت کیا ہوئی — وہ تکبر کی چڑھی ندی وہ نخوت کیا ہوئی
کیا ہوا وہ ظاہر و باطن میں خودداری کا شوق — رنگِ صورت کیا ہوا، نازک طبیعت کیا ہوئی
کس مپرسی میں ہے کیسے بتلائے بیکسی — اب بھرے مجمع پہ وہ تیری حکومت کیا ہوئی

تیری جو کشتی رواں تھی سیم و زر کے آب میں
آج وہ ڈوبی ہے آکر خاک کے گرداب میں

یہ جو تیرا جسم ہے خاکی لحد میں زیر بار — بوجھ پھولوں کا کبھی اس کیلئے تھا ناگوار
تجھ کو جز عشرت کدہ راتوں کو نیند آتی نہ تھی — ایک لمحہ بھی تجھے کرتا تھا تنہا بیقرار
خاک کے تودے میں ناداں وقفِ تنہائی ہے کیوں — اب نہ وہ عشرت کدہ ہے اور نہ یاروں کی قطار
دن میں دس دس بار تھا رنگت بدلنے کا خیال — یعنی ہر جامہ تھا تیرا گلشن زر کی بہار
ایک ہی کپڑے پہ کیوں تجھکو قناعت ہو گئی — کیا ہوا اب شوقِ بیتابی کا وہ پہلا ابھار
تجھکو سو گز بھی بلندی قصر کی کافی نہ تھی — ایک ہی گز پر ہوا اب تیرا کیوں دار و مدار
خود بخود کیونکر فنا کا جام تو نے پی لیا — موت کا جب نام سنتا تھا تو آتا تھا بخار

کچھ جو بن آتی نہیں تو آج شرمایا ہے کیوں؟
اپنی ہیئت کو بدل کر گور میں آیا ہے کیوں؟

پھول تھا بستر ترا اب خاک کا انبار ہے — اور بجائے خوابِ راحت حسرتوں کا خار ہے
تا قیامت زیست کے انجام کا قیدی ہے تو — اب نہ کوئی آشنا تیرا، نہ کوئی یار ہے
تجھ کو بیخود کر چلے جب بالشِ راحت کی یاد — سر پٹک دینے کو حاضر گور کی دیوار ہے

ہمچو از خود رفتگاں از خود رود بیہوش باش
راز را بے پردہ خواہی کیفیا خاموش باش

کیفی چریاکوٹی

حیات نظیر لودھیانوی

حسن کا دعویٰ ہے تخت و تاج کے قابل ہوں میں
عشق کہتا ہے کہ ہفت اقلیم کا حاصل ہوں میں

عقل کہتی ہے کہ میرا علم ہے لا انتہا
دل سمجھتا ہے کسی محبوب کا محمل ہوں میں

جاں نکلتی ہے کہ وہ تسکینِ جاں ہے سامنے
آنکھ روتی ہے کہ یا رب کس قدر غافل ہوں میں

ہاتھ اٹھتے ہیں کہ ہے بابِ اجابت آشکار
ہوش اڑتے ہیں کہ کس تقریب میں شامل ہوں میں

میرے دعوے پر قیامت میں خدا کے سامنے
تیغ کہتی ہے کہ قاتل یہ نہیں قاتل ہوں میں

اصل میں میری فنا میری بقا کا باب ہے
در حقیقت گم پئے سنگِ رہِ منزل ہوں میں

تیرے ہونٹوں پر تبسم اشک میری آنکھ میں
حسن کی تصویر ہے تو عشق کی محفل ہوں میں

تیرے سنگِ در سے پایا میری قسمت نے فروغ
داغ ماتھے پر نمایاں ہیں مہ کامل ہوں میں

ڈھونڈتا ہے تو مرے پہلو میں کیا دل کا نشاں
سر سے پا تک اے ستمگر یادگارِ دل ہوں میں

خارِ غم سے لالہ گوں ہے میرا ہر ذرہ نظیر
سیکڑوں گلشن ہیں جسکی گود میں وہ گل ہوں میں

نمبر ۱
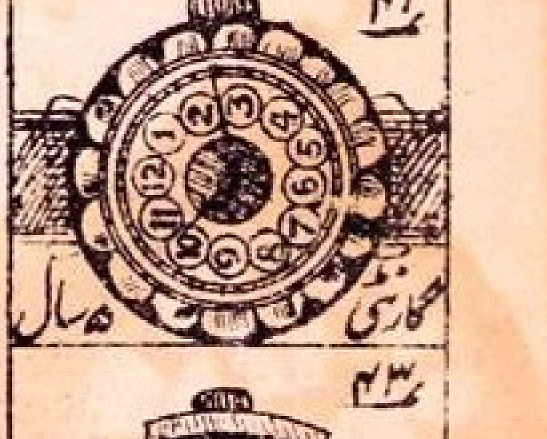
گارنٹی ۵ سال

نمبر ۲　شب چراغ

گارنٹی ۵ سال

ہر گھڑی کی قیمت چار روپے

یہ سب گھڑیاں ۲۲ کیرٹ گولڈ پلیٹنڈ یعنی سونے کے ملمع شدہ کیس کی ہیں جو خوبصورتی میں لاجواب اور مضبوطی میں لاثانی ہیں۔ وقت تو اس بلا کا صحیح بتاتی ہیں کہ قیمتی گھڑیوں کا مقابلہ کرتی ہیں ایک مستند کاریگر کی جدید ساخت ہونے کی وجہ سے فی الحال ان کی شہرت مقصود ہے اسی باعث سے ہر گھڑی کی قیمت چار روپے کم از کم رکھی ہے۔ مگر یاد رکھیئے کچھ عرصہ بعد ان ہی گھڑیوں کو آپ دس بارہ روپے میں خریدنے پر مجبور ہونگے۔ قسم اعلیٰ ۵

منیجر حبیب واچ ہاؤس اجمیری گیٹ نمبر ۱۳ دہلی سے طلب کریں

نوٹ: دس معزز اصحاب کے مفصل پتے روانہ کرنیوالے صاحبان کو ایک لاسٹنگ فینسی رسٹ بینڈ مفت ارسال کیا جائیگا

نمبر ۳
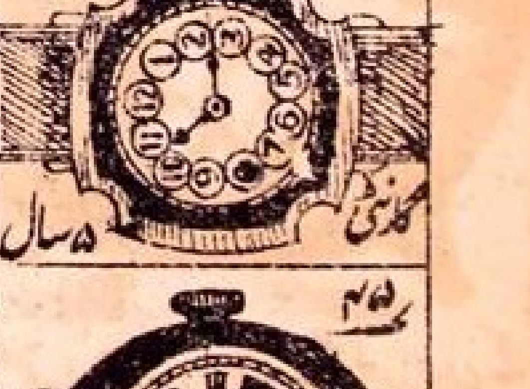
گارنٹی ۵ سال

نمبر ۴

گارنٹی ۵ سال

نمبر ۵
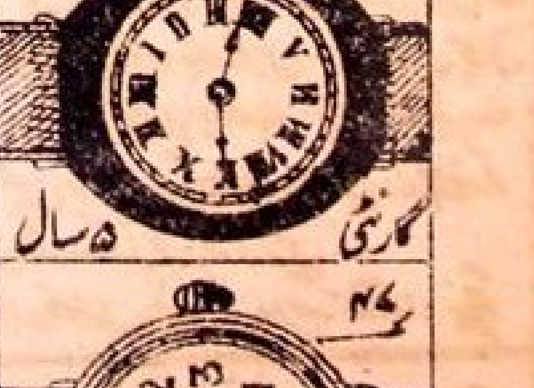
گارنٹی ۵ سال

نمبر ۶

گارنٹی ۵ سال

نمبر ۷

گارنٹی ۵ سال

نمبر ۸

گارنٹی ۵ سال

غزل تبسم صہبائی

دوست آئے کہ کوئی دوست کا پیغام آئے — آئے جس طرح سے بیمار کو آرام آئے
ابر چھایا ہے، ہوا مست ہے، گلشن خاموش — کاش اس وقت وہ ہاتھوں میں لئے جام آئے
چھوڑ دو تا کہ میں اٹھ جاؤں بھری محفل سے — ہمنشیں یاد مجھے وصل کے ایام آئے
شان ہے یہ بھی تری بزم طرب کی ساقی — کوئی بدمست ہو پی کر کوئی ناکام آئے
اس کے کوچے سے مری نعش لئے جاتے ہیں — کوئی قاتل سے یہ کہہ دو کہ سر بام آئے
وہ بھی دن تھے کہ مری شام تھی صبح اُمید — اب تو یہ حال ہے رو دیتا ہوں جب شام آئے

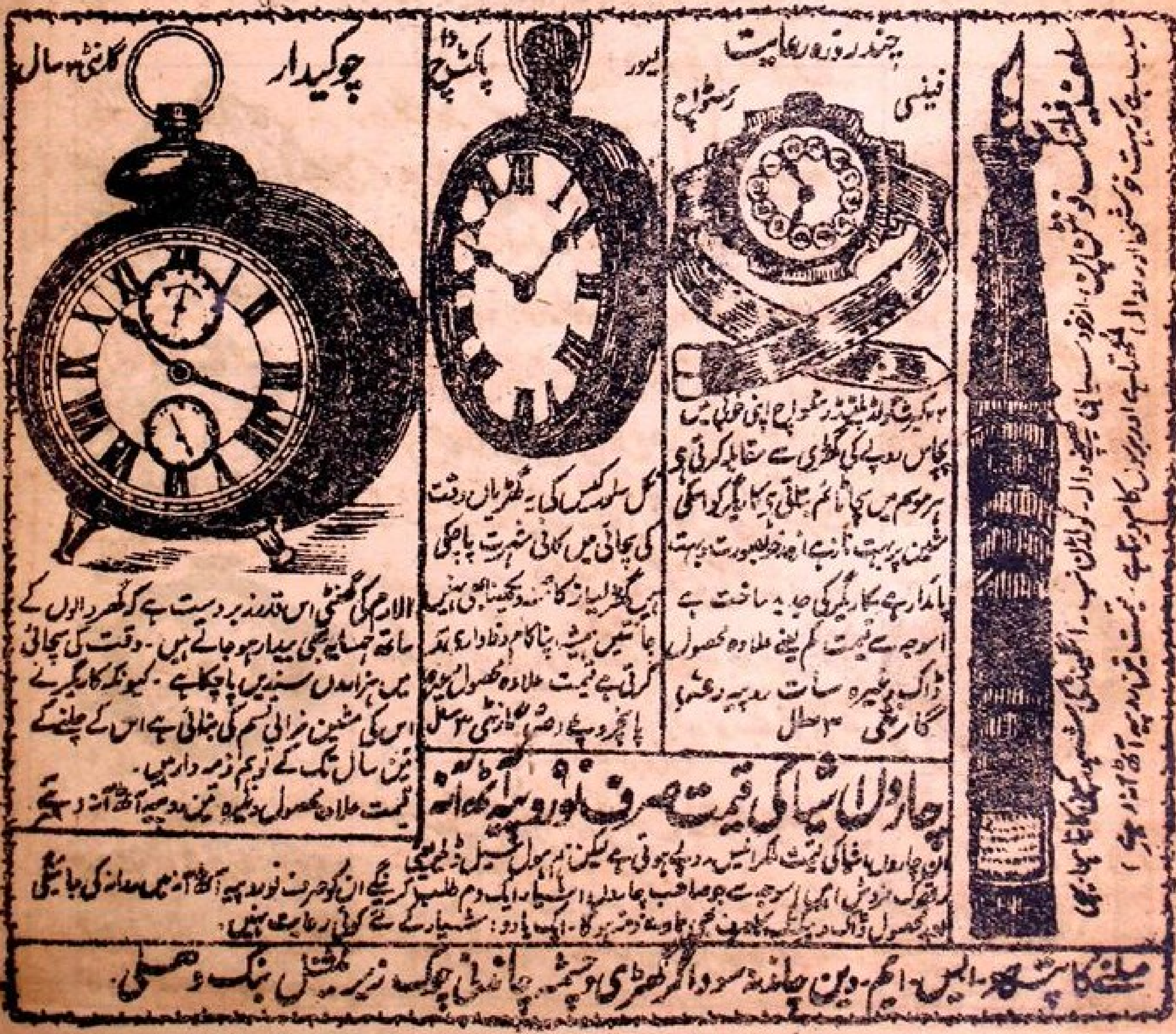

دارالاشاعت پنجاب لاہور

بچوں کے لئے کتابیں

وہ کتابیں جو اخبار پھول کے سلسلے میں چھپ کر مقبول ہوئیں اور جو تعلیم اطفال کی گویا پہلی سیڑھی ہیں۔

ننھی کتاب

ننھے بچوں کے لئے جو قاعدہ ختم کر چکتے تھے۔ ایسی کوئی دلچسپ کتاب موجود نہ تھی۔ جسے وہ شوق سے پڑھ سکتے۔ اور ان کے دل میں مطالعہ کا شوق پیدا ہوتا۔ سید امتیاز علی صاحب تاج بی اے نے یہ خوبصورت کتابیں چھاپ کر گویا بچوں کے لئے ایسے طلسمی کھلونے مہیا کر دیے ہیں جن سے کھیل کھیل کر وہ علم حاصل کر سکتے ہیں۔ ہر کتاب جلی اور کھلے کھلے حرفوں میں اسی صفحوں پر چھاپی گئی ہے۔ ان میں بیس بیس کے قریب دو رنگ اور تین رنگ کی تصویریں ہیں۔ عبارت نہایت ہی آسان اور پیاری ہے اور ایسی چیزوں پر ننھے ننھے سبق لکھے گئے ہیں جن میں بچے بیحد دلچسپی لیتے ہیں۔ قاعدہ پڑھا کر یہ کتاب بچوں کے ہاتھ میں دیدیجیے اور سمجھ لیجیے۔ ان کے دل میں پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا ہوگا۔ قیمت ۱۰/

اسی سلسلے کی دوسری کتابیں

منی کتاب ۱۰/ پیاری کتاب ۱۰/ دلاری کتاب ۱۰/ ہماری کتاب ۱۰/

تاج گیت۔ ننھے بچوں کے لئے چھوٹی چھوٹی اور پیاری پیاری نظمیں اور آسان گیت زبانی یاد کرنے کے قابل قیمت ۲/

تاج پھول۔ ننھے بچوں کے اخلاق و عادات درست کرنے کے لئے نہایت فائدہ مند سبق۔ قیمت ۴/

امتیاز پچیسی۔ ننھے بچوں کے لئے بہت سلیس زبان میں پچیس دلچسپ اور باتصویر کہانیاں۔ قیمت ۶/

پچیس کتابوں کا سٹ۔ چھوٹے بچوں کیلئے بچوں کا انصاف ۳/ خزانہ کا مالک ۳/ سچا وعدہ ۳/ مسکین ۳/ امیرا دربانس والا ۳/ عقلمند بچھتایا روس کا شہنشاہ ۳/ سفید کبوتر ۳/ لال بی بی ۳/ بہن کی محبت ۳/ گل بانو ۳/ مینڈک شہزادہ ۳/ عجیب ہنس ۳/ احسان کا بدلہ عجیب شہزادی ۳/ کبڑا بونا ۳/ فیاض بیگم ۳/ بدمزاج شہزادی ۳/ پتھر کا شیر ۳/ مغرور شہزادی ۳/ نیکی کا پھل ۳/ بدی کا بدلہ ۳/ بلوری جوتا نقلی شہزادہ ۳/ ابراہیم نائی ۳/

بچوں کا ہفتہ وار اخبار

پھول

اردو میں سب سے پہلا۔ پابند اوقات۔ کثیر الاشاعت اور مقبول عام اخبار جو اٹھارہ سال سے جاری ہے

اور جس میں

دلچسپ قصے۔ اخلاقی کہانیاں حفظان صحت اور تاریخ جغرافیے کے مضامین۔ دلچسپ معلومات اور مزے دار نظمیں عمدہ لطیفے۔ معمے اور تصویریں اور ہفتہ بھر کی ضروری خبریں درج ہوتی ہیں۔ نمونہ مفت۔ چندہ سالانہ صہ

دارالاشاعت پنجاب ۔ ۱۹۵ ۔ ریلوے روڈ ۔ لاہور

رمضان المبارک کا سالانہ رعایتی اعلان

آج ہی آرڈر دیجئے ایسا نہ ہو کہ وقت نکل جائے اور سال بھر انتظار کرنا پڑے

انگالیش خوبصورت ۱۵ سطری نئی شان کا مترجم و محشّیٰ قرآن مجید

جسکی ہر مسلمان کو ضرورت ہے ۔ مقدمہ میں ایسی خوبیاں ہیں جو مع الہ مبلغین اسلام کیلئے بیحد ضروری ہیں نہایت خوشخط صاف اور روشن چھپائی نفیس کاغذ تقطیع متوسط صحیح اور مستند حکیم الامتہ مولانا اشرف علی صاحب کا ترجمہ حاشیہ پر خلاصہ تفسیر موضح القرآن ۔ علاوہ ازیں اہم ایسی خوبیاں ہیں جو دوسری جگہ نہیں مل سکتیں جن کی تفصیل پہلے آپنے ملاحظہ فرمائی ہوگی ۔ جہاں ایک قرآن مجید گیا ہے دو دو چار چار اور ۲۰ ۔ ۲۵ تک منگائے گئے ہیں ہدیہ رعایتی مع محصول للعہ مجلد چرمی ۲ جلد ہدیہ ۳ جلد [illegible]

قرآن شریف معرا ۱۳ سطری

یہ قرآن شریف صحت و چھپائی میں لاثانی ہے قلم متوسط صفحات ۱۰۴۰ مجلد چرمی تقریبی بین السطور واضح ۔ بچے بوڑھے چھوٹے بڑے نہایت آسانی کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں ۔ ہر لفظ پر اعراب ٹھیک ٹھیک نہایت صحیح لگے گئے ہیں ۔ ہر پارہ علیحدہ علیحدہ ہے اور ہر سورۃ نمایاں ۔ صحت کے ثبوت میں صرف اتنا سمجھنا کافی ہے کہ دنیا اسلام کی مشہور ترین درسگاہ دیوبند کے مطبع میں نہایت احتیاط کے ساتھ طبع ہوا ۔ اور بعض مشہور و مستند جید علماء و حفاظ نے اسکی صحت کی تصدیق مولانا عزیز الرحمن صاحب مفتی دیوبند ۔ مولانا مولوی اعزاز علی صاحب مدرس دیوبند ۔ مولانا سراج احمد صاحب وغیرہ تمام رموز اوقات نظم میں بیان کر دیئے ہیں تعداد و حروف سورۃ فی قسمہ مثلاً قرآن میں الف ۔ ب اور ب ۔ ۱۲ اسی طرح سورتوں اور اعرابوں کی تعداد کا و اقر بھی شامل ہے ہدیہ چرمی مجلد رعایتی ہے علاوہ محصول

قرآن مجید معرا

بلحاظ سے وانستے بنا بہت عمدہ [illegible] خوبصورت حروف الگ الگ اور صاف ہیں نہایت صحیح ۔ ہر پارہ علیحدہ علیحدہ کاغذ سفید ولایتی کیلئے سجدہ میں رکھا جا سکے اور ہدیہ جو بالکل رہنے لگے ۔ کتنی جلدیں خرید کر خوب ہدیہ ہر مکتب قائم رکھنے ہدیہ ۔ ۔ ۔ رعایتی ۸ ۔ ۔ مجلد ۱۰ علاوہ محصول

دلائل الخیرات مترجم محشی

یہ مشہور حضرت علامہ ۔ ۔ ۔ موسوی مفتی محمد کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند ایک ایسے سائز پر چھپی ہے جو جیب میں سہولت سے کام کرنے خوب چلی ہو خوشخط اور روشن ہے ۔ ۔ ۔ بھی بآسانی پڑھ سکیں اور ساتھ ہی الحد ۔ ۔ ۔ خیر حصہ ۔ ۔ ۔ جبر کتابوں سے بہتر حاشیے چڑھائے گئے ہیں ۔ ۔ ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نقشہ مبارک ۔ ۔ ۔ مع ترجمہ مجالس ہونا دعوت کیلئے بیحد ۔ ۔ ۔ میں لکھکر ۔ ۔ ۔ آپ سے پاس بھی ۔ ۔ ۔ ہدیہ رعایتی مجلد عمر علاوہ محصول

برکات رمضان

اسلامی روزہ کا فلسفہ عقلی و نقلی دلائل سے ثبوت اردو زبان میں مسائل و ارکان صیام میں اپنی نرالی طرز کا پہلا جدید رسالہ جس میں پچاس عنوانات کے تحت میں روزہ کی فرضیت نیت روزہ رویت ہلال روزہ کے آداب فضائل و مفسدات روزہ روزہ کا ثواب تکمیل یعنی مجنون حضرت موسیٰ روزے حضرت موسیٰ کی جگہ کتنی عورتوں کا روزہ خوف و رجا روزہ کن چیزوں سے افطار کرنا چاہئے ۔ تراویح و تلاوت قرآن مسائل تراویح تسبیح تراویح اعتکاف شب قدر لیلۃ القدر شب مقدسہ کا نزول انوار شب قدر حضرت شمعون کا قصہ انگی عاقبت اندیشی حیرت ورکی قوم کا ختم بنی اسرائیل کے چار پیغمبر لیلۃ القدر کی علامت امت محمدیہ کی شب قدر صدقۃ الفطر مسائل عیدین وغیرہ وغیرہ کے علاوہ ازیں حضرت ۔ ۔ ۔ کی تقاریظ سے مزین صفحے ۸۰ قیمت رعایتی ۴ر

سیرت الحبیب

صلعم کے متعلق تقریظ کرتے ہوئے عالیجناب مولانا مولوی مفتی محمد کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند دہلی فرماتے ہیں نبی عربی ۔ ۔ ۔ حالات پیاری زبان اردو کی سلیس و شیریں عبارت میں ملاحظہ کرنے کا شوق ہو تو اس سے بہتر شاید دوسری کتاب آپ کو نہ ملیگی ۔ دیگر یہ کہ مولف نے کتاب کو دلچسپ بنانے کے ساتھ سلف صالحین کے طریقہ کی پیروی بھی محوظ رکھی ہے بہت جگہ آیات قرآنیہ اور احادیث معتبرہ سے استشہاد کیا ہے ۔ کتاب ۱۹۴ صفحہ میں ہے اور یہ سیرت خود ایک ۔ ۔ ۔ ہیں حضور اکرم کے مقدس حالات زندگی قبل نبوت سے معراج شریف تک کے واقعات معراج کو عقلی و نقلی دلائل سے ثبوت ۔ ۔ ۔ معراج کے شبہات کا ازالہ ۔ ۔ ۔ ہجرت اور جنگ بدر ۔ ۔ ۔ اعراب ۔ ۔ ۔ اور حوالہ ۔ ۔ ۔ تقریباً ۔ ۔ ۔ سو عنوان ہیں خود پڑھئے اور بچوں اور عورتوں کو پڑھنے کیلئے دیجئے قیمت رعایتی ۱۲ اریر

آنحضرت کی بیبیاں

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے سوانح زندگی ۔ ۔ ۔ دنیا کا ۔ ۔ ۔ برکت ۔ ۔ ۔ اردو ادب میں بہترین اضافہ کرنے کے قیمت رعایتی ۱۲ اریر

مخدرات تیموریہ

سلاطین مغلیہ کی مستورات کا عالیشان سلسلہ عصمت و عفت کے پاکیزہ کرشمے ۔ بیرا کیمپ شجاعت اور سخاوت کی تاریخ کی جان ہے اسمیں تقریباً سو سوا سو بیگمات کے سوانح و حالات درج ہیں ۔ خود پڑھئے اپنی بیگمات کو پڑھائیے رعایتی ۔ ۔ ۔

مخدرات اسلام

صحیح احادیث تقریباً ۔ ۔ ۔ نامور عورتوں کی سوانح عمریاں جس سے معلوم ہوگا کہ دنیا میں خدمات کی کس قدر ضرورت ہے مولانا ۔ ۔ ۔ نے بڑی محنت سے حالات لکھے ہیں قیمت ۸ر رعایتی ۱۲ر

احسن المواعظ

مبلغین و واعظین کیلئے بیحد مفید کتاب ہے اردو زبان میں چار رسالہ ۔ ۔ ۔ کے چیدہ چیدہ مقالات ہیں ۔ ۔ ۔ مطالعہ ہر مرتبہ محبت پیدا ہو ۔ شعبان رمضان کیلئے اس سے اچھا وعظ ۔ ۔ ۔ میں نہیں ملیگا مصنفہ مولانا ابراہیم صاحب مرحوم رعایتی ۱۲ر

افضل المواعظ

جو سرور کائنات صلعم کے حالات ولادت ۔ ۔ ۔ معراج ۔ ۔ ۔ ہجرت ووفات شفاعت تک مفصل بیانات کا خزانہ ہے اور اسمیں ۔ ۔ ۔ لطیف نکات اور ارشادات ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ مصنفہ مولانا محمد ابراہیم صاحب مرحوم قیمت ۸ر رعایتی ۱۲ر

تحیۃ الاسلام

اسلامی سلام قومی شعار (السلام علیکم) کی ضرورت اور حقیقت اور اسکی فضیلت کو فلسفیانہ رنگ میں نہایت مدلل و پر اثر پیرایہ میں لکھا گیا ہے عبارت ایسی عام فہم سلیس اور دلچسپ ہے کہ پڑھنے سے رقت اور کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے قیمت صرف ۳ر رعایتی ۲ر

آپکی عمر اکیسویں سال ۱۰۰ سال کی ہو سکتی ہے

آپ زندہ رہنے ساتھ ہزار بیٹے پوتے اور پڑپوتے چھوڑ سکتے ہیں ۔ دہلی کے ایک دانشمند طبیب نے یہ عجیب و غریب کتاب لمبا سال کی محنت میں تیار کی ہے کتاب کیا ہے آب حیات ہے مسیح الملک حکیم اجمل خان صاحب نے اس کو صحیح اور کامل عمل بتا کر بیحد پسند کیا اور ۵۰۰ روپیہ محنت کا انعام دلایا ۔ ضرور منگا لیجئے اور ان ہدایات پر عمل شروع کر دیجئے کتاب کا نام مفتاح الصحت قیمت ۱۲ر رعایتی ۱۰ر

حکیم کا عمل ہاتھ

آپکی کتاب پڑھنا صحیح لکھنا چاہتے ہیں کہ ہر ہر عورت ہر جوان ہر بوڑھا ہوا آدمی افسر بے ہماری ہیں عجیب و غریب کتاب عمل تجربہ کی ہوا ہاتھوں پر عمل کرنے سے آپ کا مطلب آپکا رنج آپکا دل ٹھیک ہو جائیگا ۔ کتاب میں جو باتیں لکھی گئی ہیں نہایت آسان ہیں اور ہر شخص ان پر عمل کر سکتا ہے ۔ ۔ ۔ قیمت والیس قیمت ۸ر رعایتی ۸ر ۔ ۔ ۔

اب گھیتی نباتا دشوار نہیں

گھیتی نباتات و مسائل متعلق زراعت کے خوب سمجھ کر ۔ ۔ ۔ اور چند روز میں دولتمند بن جائیے ۔ آجتک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ہو گی خریدار ۔ ۔ ۔ خریدیے اس کی قیمت ۔ ۔ ۔ روپیہ ۔ ۔ ۔ اب کتاب نہیں منگا رہے ۔ ۔ ۔ کر رہے ہیں ۔ آج ہی منگائیے

نو ایجاد نہری چوڑیاں

جن کے اندر رنگ برنگ کی ۔ ۔ ۔ چوڑیاں جا اتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہترین ہیرے جواہرات جڑے ہوئے ہیں قیمت سہ رنگی جوڑی کی ایک درجن ۱۴ر چار درجن ۱۲ر دو درجن للعہ ۲۴ درجن ۔ ۔ ۔ محصول وغیرہ علاوہ

ملنے کا پتہ: حاجی محمد حسین خوشنویس دہلی
نمبر ۱۵۷۸ کوچہ چیلان